بسم اللہ الرحمن الرحیم

جان کر منجملۂ خاصان میخانہ تجھے
مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ تجھے

تذکرہ استاذ العلماء

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ

(ولادت: ۲۸/ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ مطابق ۵/فروری ۱۹۵۱ء -وفات: ۲۲/ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۹/ستمبر ۲۰۱۳ء)

اختر امام عادل قاسمی

دائرۃ المعارف الربانیۃ

جامعہ ربانی منورواشریف ضلع سمستی پور بہار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب:- تذکرہ استاذ العلماء حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ

مصنف:- مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی

صفحات:- ۱۲۹

سن اشاعت:- ۱۴۴۵ھ مطابق ۲۰۲۳ء

ناشر:- دائرۃ المعارف الربانیۃ جامعہ ربانی منورواشریف سمستی پور بہار

قیمت: ۱۷۵/روپے

ملنے کے پتے

☆مرکزی مکتبہ جامعہ ربانی منورواشریف ،پوسٹ سوہما ، ضلع سمستی پور بہار 848207 موبائل نمبر:9473136822

☆مکتبہ الامام ، سی 212 ، امام عادل منزل ، گراؤنڈ فلور ، شاہین باغ ، ابوالفضل پارٹ ۲، اوکھلا، جامعہ نگر، نئی دہلی 25 موبائل نمبر: 9934082422

فہرست مندرجات

سلسلہ نمبر	مضامین	صفحات
۱	عرض مؤلف	۸
۲	ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم.....	۹
۳	لافانی زندگی	۹
۴	زندۂ جاوید	۱۰
۵	مولانا کا اصل امتیاز	۱۱
۶	پھونک کر اپنے آشیانہ کو	۱۲
۷	میرے تعلق کی ابتدا	۱۳
۸	مدرسہ وصیۃ العلوم الٰہ آباد-کچھ یادیں	۱۴
۹	مدرسہ وصیۃ العلوم کی شان	۱۵
۱۰	دیوبندی بریلوی کشمکش	۱۶
۱۱	میرے گھر کا خانقاہی مزاج	۱۶
۱۲	مشرب صوفیاء	۱۷
۱۳	ایک چرواہے کا قصہ	۱۸
۱۴	معصوم بچپن کی دعا	۲۰
۱۵	قافلہ سوئے دیوبند	۲۰
۱۶	لکڑی کی کھڑاؤں	۲۱
۱۷	کہکشاؤں کی ایک انجمن	۲۱
۱۸	اساتذہ کی محبت وعقیدت	۲۲
۱۹	میں نے جو خانقاہ دیکھی تھی.....	۲۲

سلسلہ نمبر	مضامین	صفحات
۲۰	خانقاہ وصی الٰہی کا مسند نشیں	۲۳
۲۱	ایک شیخ نقشبند.....	۲۴
۲۲	مولاناؒ خانقاہ وصی الٰہی میں	۲۴
۲۳	میرے والد ماجد کی الٰہ آباد آمد	۲۶
۲۴	منورواتشریف آوری اور مکاتبت	۲۷
۲۵	غازی پور میں ہمارے قافلہ کی آمد	۳۱
۲۶	شوکت منزل-جہاں میری کتنی یادیں آسودۂ خواب ہیں	۳۱
۲۷	گنگا کا تاریخی ساحل	۳۲
۲۸	غازی پور کی تاریخی اہمیت	۳۴
۲۹	غازی پور کا یادگار سرمایہ-مدرسہ دینیہ	۳۷
۳۰	ایک یادگار رات	۳۸
۳۱	مدرسہ دینیہ کا خوبصورت تعلیمی ماحول	۳۸
۳۲	مدرسہ دینیہ کے اساتذۂ باکمال	۳۹
۳۳	مولانا اعجاز احمد صاحب کی مردم ساز شخصیت	۴۰
۳۴	استاذ کامل کی صفات	۴۳
۳۵	مدرسہ دینیہ میری نگاہ میں	۴۴
۳۶	مولاناؒ کی زندگی کا عہد زریں	۴۵
۳۷	مولانا کا طریقۂ تعلیم وتربیت	۴۶
۳۸	میرے قطبی پڑھنے کا قصہ	۴۷
0	....	

سلسلہ نمبر	مضامین	صفحات
۳۹	علوم قاسمی کی طرف توجہ	۴۸
۴۰	میرا شوق مطالعہ	۵۰
۴۱	میری قلمی زندگی کا آغاز	۵۱
۴۲	مولانا کی وسیع النظری	۵۳
۴۳	بہار پھر اپنی پہلی تاریخ کی طرف واپس آئے	۵۳
۴۴	علمی اختلاف واتفاق	۵۶
۴۵	پیر طریق کی موجودگی میں دوسرے پیر کی طرف رجوع	۵۷
۴۶	قبول حق میں فراخ دل	۶۰
۴۷	مولانا سے میری مراسلت	۶۲
۴۸	قصہ میری پہلی تالیف کا	۶۶
۴۹	ذوق مناظرہ	۷۰
۵۰	میری طالب علمی کے ایک مناظرہ کا دلچسپ قصہ	۷۱
۵۱	آج میں نے خواب کی تعبیر دیکھ لی.....	۷۲
۵۲	منورواشریف کی آخری آمد	۷۳
۵۳	حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کا علمی مقام	۷۶
۵۴	علمی امتیاز	۷۶
۵۵	مولانا کا موجودہ علمی سرمایہ ان کے علم کا بہت تھوڑا حصہ	۷۷
۵۶	قرآنی بصیرت وخدمات	۸۰
۵۷	مسئلۂ تقدیر پر آیت قرآنی سے استدلال	۸۱
0	.....	

سلسلہ نمبر	مضامین	صفحات
۵۸	قرآن وحدیث میں "فطرت" سے مراد	۸۳
۵۹	علم حدیث اور خدمات جلیلہ	۸۷
۶۰	فتنۂ انکار حدیث کا تعاقب	۸۷
۶۱	کتب احادیث کا تعارف	۸۸
۶۲	ضعیف اور موضوع احادیث کے متعلق محدثین کی اصطلاحات	۸۸
۶۳	حضرت امام محمدؒ پر محدثین کے الزامات کا علمی جائزہ	۸۸
۶۴	کتابت حدیث کے اصول و قواعد	۸۸
۶۵	مولانا کا تفقہ اور خدمات فقہیہ	۸۹
۶۶	تدریس فقہ کا طریقۂ نایاب	۸۹
۶۷	فقہی مقام	۹۰
۶۸	ایک جدید ترین مجموعۂ قوانین اسلامی کی تجویز-جو شرمندۂ تعمیل نہ ہو سکی	۹۰
۶۹	مولانا کی فقہی تحریرات پر ایک نظر	۹۱
۷۰	عنین کے فسخ نکاح کا مسئلہ	۹۲
۷۱	اذان میں لفظ اللہ کے مد کی تحقیق	۹۴
۷۲	ہندوستان میں تقرر قاضی کا مسئلہ	۹۵
۷۳	فقہی سیمیناروں کی مناسبت سے تحریر کردہ مقالات	۹۸
۷۴	فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کا ثبوت	۱۰۰
۷۵	علم تصوف واخلاق اور خدمات جلیلہ	۱۰۰
۷۶	تصوف پر آپ کا عظیم الشان قلمی سرمایہ	۱۰۱
۷۷	صوفیاء کے یہاں مسئلۂ وحدۃ الوجود	۱۰۲

سلسلہ نمبر	مضامین	صفحات
۷۸	تصور شیخ	۱۰۳
۷۹	علم کلام اور معقولات	۱۰۵
۸۰	مولانا کی عظیم معقولی شخصیت کا انکشاف	۱۰۵
۸۱	کلامی مباحث پر مولانا کے مکاتیب کا پس منظر	۱۰۶
۸۲	بزرگوں کے طرز تحریر کی نقالی-میرا عہد رفتہ	۱۰۶
۸۳	مولانا کے علمی مکاتیب دقیق مضامین پر مشتمل ہیں	۱۰۸
۸۴	مولانا سے میری علمی مراسلت کا آغاز	۱۰۸
۸۵	میرے سوال وجواب کا طریقہ-سوال کے ساتھ مجوزہ جواب بھی منسلک کرتا تھا	۱۰۹
۸۶	نبوت بالذات اور بالعرض کے مسئلہ پر میرا مجوزہ جواب اور مولانا کی اصلاح	۱۱۰
۸۷	خلاصۂ جواب لکھنے کا معمول	۱۱۳
۸۸	انکار صفات باری کے مضرات پر میری پیشگی جواب آرائی	۱۱۵
۸۹	اپنے دور میں فن معقولات کے امام	۱۲۰
۹۰	امکان کذب کے مسئلہ کو خلف وعید سے اصلاً کوئی تعلق نہیں	۱۲۱
۹۱	خلف وعید کی تشریح مولانا کے فکر واجتہاد پر مبنی	۱۲۳
۹۲	معتزلہ صفات باری تعالیٰ کے قائل نہیں تھے-مولانا کی تحقیق	۱۲۴
۹۳	علم کلام کا موضوع تردید ضلالت ہے تشریح عقائد نہیں-مولانا کا ایک خاص نکتہ	۱۲۶

عرض مؤلف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدالله رب العالمين والصلوٰة والسلام علىٰ نبيناسيدالمرسلين ! امابعد

حضرت الاستاذ خاتم المدرسین، زبدۃ المحققین مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کی وفات کے بعد میں نے ایک مفصل تأثراتی تحریر لکھی تھی جس میں حضرت مولانا کے امتیازات وکمالات اور طریقۂ تعلیم وتربیت پر روشنی ڈالی گئی تھی، وہ تحریر بعد میں "ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم۔۔۔" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئی، لیکن اس مضمون میں حضرت کے علمی حصہ پر زیادہ گفتگو نہیں آسکی تھی، مجھے اس کا احساس تھا، اور ارادہ تھا کہ حضرت کے علمی حصہ پر بھی میں لکھوں گا، حسن اتفاق ایک خاص مناسبت سے مجھے حضرت کے علمی حصہ پر لکھنے کی توفیق میسر آئی، چنانچہ اس کتاب میں اس مضمون کو بھی شامل کر دیا گیا ہے، نیز پچھلے حصہ میں کچھ حک وفک بھی کیا گیا ہے، اس طرح حضرت مولانا کی زندگی پر ایک اچھی علمی اور دستاویزی چیز تیار ہوگئی ہے، امید ہے کہ اس نئے مجموعہ کو بھی قبولیت حاصل ہوگی، اور حضرت مولانا کی شخصیت پر کام کرنے والوں کے لئے یہ کتاب مشعل راہ ثابت ہوگی ان شاء اللہ۔

اختر امام عادل قاسمی

۲۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۵ھ مطابق ۱۱/ دسمبر ۲۰۲۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم.....

"زندگی بلبلہ ہے پانی کا".....قطرہ کی اٹھان کا نام زندگی اور اس کی اتار کا نام موت ہے.....بلبل کی چہک، کوئل کی لہک، شعلہ کی لپک رواں دواں زندگی کی علامت ہے اور ان کی خاموشی موت کے ہم معنٰی.....عروج اور زوال اس دنیا کی ناقابل انکار حقیقت ہے، زندگی کی طرف سفر کرنے کا نام عروج اور موت کی طرف قدم بڑھانے کا نام زوال ہے،.....کسی شئ کا وجود خود اس کے عدم کی دلیل ہے،.....ہر بلندی کے پیچھے ایک پستی چھپی ہوتی ہے، انسان کی پوری زندگی اسی بلندی وپستی کو عبور کرنے میں گذر جاتی ہے،.....جب انسان کچھ نہیں تھا تو وجود میں آجاتا ہے، اور شہود میں آتے ہی عدم کا سفر شروع ہو جاتا ہے.....

جب قابل ذکر نہیں تھا تو اس کو ایک نام اور ایک سلیقہ دیا گیا اور جب اسی سلیقہ اور ہدایت الٰہی کی روشنی میں وہ شہرت کی بلندیوں پر پہونچا اور ہر طرف اس کے ذکر کے غلغلے بلند ہوئے تو اسے خاموش سناٹے میں پہونچا دیا گیا جہاں سے کسی کی واپسی ہوئی ہے نہ ہو گی۔

لافانی زندگی

یہ ایک سچی حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر چیز کی طرح انسانی زندگی بھی فانی ہے،.....لیکن اس سے بڑی سچی حقیقت یہ ہے کہ خود انسان اپنی ذات میں لافانی ہے، بقول خمار بارہ بنکوی:

یہ مانا زندگی فانی ہے لیکن
اگر آجائے جینا جاوداں ہے

یہ جینا جسے آجائے وہ کبھی نہیں مرتا، اس کی ہستی اس کے جسد خاکی کی اسیر نہیں ہوتی، اس کا وجود زندگی کے نشیب وفراز کا پابند نہیں ہوتا، یہ دنیائے آب وگل اس کی شخصیت کے لئے زنجیر نہیں بنتی، زندگی اور موت اس کے عروج وزوال کی علامت نہیں بلکہ یہ دونوں حیات مستعار ہی کے الگ الگ

عنوان ہوتے ہیں، زندگی بھی زندگی ہے اور موت بھی اس کے لئے حیات جاوداں کی نوید ہوتی ہے، نہ اس کی زندگی میں اسے مٹایا جاسکتا ہے اور نہ اس کے مرنے کے بعد اس کو بھلایا جاسکتا ہے،.....جب تک انسان فرش گیتی پر رہتا ہے صرف زندہ رہتا ہے، لیکن جب وہ روح ناسوت تک پہونچ جاتا ہے اور انسانی دلوں کے عرش الٰہی پر بسیرا کرلیتا ہے تو وہ زندۂ جاوید بن جاتا ہے، اس کا جسم قبر کی آغوش میں اور اس کا وجود لوگوں کے قلوب میں محفوظ ہوجاتا ہے،.....دل گوشت پوست کے لوتھڑے کا نام نہیں بلکہ یہ عرش الٰہی ہے، دل کی دنیا بڑی البیلی، بڑی ناپیدا کنار ہے، صدیوں بلکہ ہزاروں سال تک انسان وہاں زندہ رہتا ہے، اسے زندہ رہنے کے لئے نہ کسی نشیمن کی ضرورت ہے اور نہ پرواز کے لئے بال وپر کی، وہ بلندیوں اور وسعتوں میں اقبالؔ کے شاہین سے بھی ماوراہو جاتا ہے۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

یہ چیزیں لکھنے میں جتنی آسان ہیں، برتنے میں اتنی آسان نہیں ہیں، صدیوں میں دوچار خوش نصیب ہوتے ہیں جو ایسی زندگی پاتے ہیں، بقول شاعر:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مدت میں ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

زندۂ جاوید

ہم نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں جن چند ممتاز ہستیوں کو زندگی کی اس تعریف کا مصداق پایا ان میں میرے استاذ مکرم، مربی کبیر حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ سر فہرست ہیں، جو ساری زندگی قید مقام سے بالاتر رہے، ہمیشہ دلوں کے مکین رہے، جاننے والوں نے ہمیشہ ان کو ان کی نسبت ذات سے جانا، تعارف کے لئے کسی مقام کی نسبت ان کے لئے محض عارضی رہی، جہاں رہے پوری آب وتاب کے

ساتھ رہے، اصولوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، اقامت وسفر، مکان ومقام، تنہا یا جماعت اور فراوانی وبے سروسامانی ان کی زندگی میں بے معنیٰ الفاظ تھے،.....وہ ہمیشہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے، ان کا لمحہ لمحہ مضطرب اور گھڑی گھڑی بے چین گذری، وہ اقامت میں بھی سراپا سفر اور سفر میں بھی میں یکگونہ مقیم رہتے تھے،..... جہاں رہے اپنے کارواں کے ساتھ رہے،.....پروانوں کو شمع کی ایسی تلاش رہتی کہ جہاں گئے وہیں کارواں بن گیا،.....ایسا منبع فیض استاذ کم دیکھا گیا، جہاں جہاں گذر گئے روشنی پہونچ گئی، جہاں جہاں ٹھہر گئے درسگاہ بن گئی،..... علم کا نمود ونفوذ جیسا ان کی شخصیت میں دیکھا کہ شاید آج کسی اور کو ان کی مثال کہہ سکیں۔

مولانا کا اصل امتیاز

مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے عہد کے سب سے بلند ترین آدمی تھے،..... نہیں، مختلف علوم وفنون اور نوع بنوع کمالات میں ان سے بھی قد آور لوگ موجود ہیں، خود ان کے اساتذہ ومشائخ تھے، علاوہ بہت سی صاحب کمال اور یگانۂ روزگار شخصیتیں موجود تھیں اور ہیں،..... مگر جو بات ان کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا انداز تربیت، اہل طلب سے حسن تعلق، درس وتدریس اور علم وفن کی توسیع واشاعت کے لئے حد درجہ فنائیت اور اکابر کے روایتی نظام تعلیم وتربیت پر اس قدر یقین کہ اس میں کسی لچک کی گنجائش نہیں تھی..... وہ جس چیز پر یقین کرتے تھے اس کو منوانا بھی جانتے تھے، اور اس میں ان کی ذہانت وذکاوت اور علمی حاضر دماغی سے زیادہ ان کی جاذبیت اور بے پناہ اپنائیت کا دخل ہوتا تھا،..... آج جبکہ زیادہ تر لوگ ابلاغ وترسیل سے زیادہ اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے ،مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کا کمال یہ تھا کہ وہ اپنی کوششوں کے نتائج کے لئے بھی بے چین رہتے تھے،.....اور اسی لحاظ سے وہ کبھی مظہر جلال نظر آتے تھے تو کبھی پیکر جمال، قلب میں گداز اور روح میں سوز ایسا جو کبھی اثر سے خالی نہیں جاتا تھا،.....ان چیزوں نے ان کی شخصیت کو مقناطیسی بنادیا تھا، جہاں گئے طلبہ کا قافلہ ہمراہ گیا، پوری زندگی مشتاقان علم کے ہجوم میں گذری، محفل تو محفل گوشۂ عافیت میں بھی فرصت نہیں ملی اور وہ اس کے ایسے لذت آشنا کہ مجال تھی کہ چہرہ پر ناگواری کی شکن بھی آجائے.....اللہ ان کو

غریق رحمت فرمائے آمین۔

پھونک کر اپنے آشیانہ کو

خود وغرضی ومادیت کے اس دور میں تدریس فن اور تربیت ذات کے لئے زندگی کا ایک ایک لمحہ لگادینے والا اور اپنے لئے کچھ نہ بچار کھنے والا استاذ کمیاب نہیں، نایاب ہے، اس معاملہ میں ان کی شخصیت کسی اعجاز سے کم نہ تھی۔

پھونک کر اپنے آشیانہ کو
بخش دی روشنی زمانہ کو

حالانکہ ایسا نہیں تھا کہ وہ اپنے لئے کچھ کرنے کی قدرت نہ رکھتے تھے،.....ان کے دم سے کتنے ہی اداروں کا وقار قائم ہوا، ان کی آمد سے بڑے بڑے مدرسوں اور جامعات کی عظمتوں میں چار چاند لگ گئے، ان کی برکت قدم سے معمولی مکاتب علم وفن کی بڑی درسگاہوں میں تبدیل ہوگئے.....ان کے پاس نہ افراد کی کمی تھی اور نہ وسائل کی، وہ چاہتے تو خود اپنا ایک بڑا دارالعلوم بناسکتے تھے،..... لیکن اس فقر اختیاری کو کیا کہئے کہ ساری زندگی اپنا ذاتی آشیانہ بھی نہ بناسکے کہ شاہین کسی بسیرے کا پابند نہیں ہوتا، ان کی نگاہ ہمیشہ اپنے پروردگار کی مرضی پر ٹکی رہی،.....خود مولانا کے الفاظ میں:

> "اللہ نے مجھے اولاد کی نعمت سے نوازا مگر میرے پاس رہائش کے لئے کوئی مکان کبھی نہیں رہا، جس مدرسہ میں پڑھایا وہاں کے لوگوں نے میری رہائش کا انتظام کیا ،اپنے گاؤں میں تعطیلات میں آیا تو کسی رشتہ دار کے خالی مکان میں رہ لیا، کچھ وقت والد کے مکان میں گذار لیا، اس کی وجہ سے کبھی کبھی تنگی پیش آتی تھی مگر میری لاابالی طبیعت اسے نظر انداز کر دیتی تھی۔۔[1]

اخیر میں اپنے بچوں کے لئے تھوڑی سی فکر پیدا ہوئی تھی، اپنے مجموعۂ مکاتیب "حدیث

---

[1] ۔سہ ماہی سراج الاسلام چھپرہ ضلع مئو یوپی شمارہ محرم تا ربیع الاول ۱۴۳۵ھ ص ۲۷

دوستاں" میں لکھتے ہیں:

"پچھلے کسی خط میں میں نے عرض کیا تھا کہ اب وہ دن قریب ہے کہ میرے بچوں کو اپنا اپنا گھر آباد کرنا ہو گا لیکن گھر تو ہے نہیں اور نہ گھر کا کوئی انتظام ہے، غیب میں سب کچھ ہے، اس کے شہود میں آجانے کی دعا فرمادیجئے[2]

حیات مستعار کو الوداع کہنے سے تھوڑے دنوں قبل اپنے بچوں کے لئے وادئ غربت میں ایک اجڑے ہوئے تالاب کے کنارے ایک مکان کی شروعات کی تھی مگر اس کی تکمیل وتزئین سے قبل ہی شہر خموشاں کے مکین ہوگئے اور اپنے مکان ناتمام کے بازو میں اپنی آخری منزل بنائی اناللہ وانا الیہ راجعون..... جانب مشرق مدرسہ کی مسجد ہے، مسجد سے شرق میں اس مدرسہ کی ناپختہ عمارات ہیں جس کو حضرت مولاناؒ کی آخری آرامگاہ بننے کا شرف حاصل ہوا..... مکان سے متصل مسجد کے جنوب میں وہ خالی زمین ہے جہاں مولانا روحانیت کی درسگاہ (خانقاہ) کھولنا چاہتے تھے..... لیکن عمر نے وفانہ کی اور ان کو اس کا موقعہ نہ مل سکا، کاش اگر ایسا ہو جاتا تو مولانا کا جو سوز جگر اور انداز تربیت تھا دنیا دیکھ لیتی کہ اس میدان میں بھی کیسے کیسے لعل وگہر نکلتے،..... آج اس ویرانے میں مولانا مرحوم کا مرقد روحانیت کا مسکن اور محبت وسکینت کا مینار معلوم ہوتا ہے، فرحمہٗ اللہ

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

میرے تعلق کی ابتدا

مولانا سے میرا تعلق بہت قدیم ہے، میں مولانا کے اس دور کے شاگردوں میں ہوں جب ان پر گوشہ نشینی اور خلوت پسندی کا غلبہ تھا، لوگوں سے بہت زیادہ ملنا جلنا ان کو پسند نہیں تھا، نہ کہیں آنا نہ جانا، نہ کسی جلسہ ودینی تقریب میں شرکت، کسی شدید ضرورت ہی کے لئے باہر جانا ہوتا تھا، جیسے کوئی

---

[2] – حدیث دوستاں ص ۶۰

شکستہ دل حکمراں ساری دنیا سے بیزار ہو کر کسی ویران مقبرہ کے کھنڈر میں پناہ گزیں ہو جائے،.....اتفاق سے ان کو جگہ بھی حضرت شاہ وصی اللہؒ فتحپوری ثم الٰہ آبادیؒ کی حویلی کے اس حصہ میں ملی تھی جہاں خانقاہ کے نام پر ایک کھپڑا پوش خام عمارت تھی، اس کے بازو میں چھوٹے چھوٹے چند کمرے تھے، انہی میں سے ایک کمرہ مولانا کو ملا ہوا تھا، دوسری طرف ایک حصہ میں مولانا کے اہل وعیال رہتے تھے،..... وہیں ایک طرف مدرسہ کا مطبخ تھا، جہاں دوپہر کو اور شام میں طلبہ کھانا لینے کے لئے آتے تھے اور تھوڑی دیر کے لئے چہل پہل ہو جاتی تھی، پھر وہی سناٹا.....

ابتدا میں مجھے مدرسہ والی مسجد (جس کو ڈھال والی مسجد کہتے تھے) کے ایک کمرہ میں جگہ ملی تھی، بعد میں اسی کھپڑا پوش خانقاہ میں ٹھکانہ ملا اور چونکہ فرش کچا تھا اس لئے چارپائی خریدنی پڑی، میرے ساتھ میرا بھائی رضوان احمد بھی تھا اس لئے دو چارپائیاں خریدی گئیں، میری عمر اس وقت بمشکل دس سال کی ہوگی،..... لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ یہ ساری کاروائی ہمارے مولانا ہی نے انجام دی تھی،.....اس واقعہ کو چونتیس (۳۴) سال (بوقت تحریر) کا عرصہ بیت گیا، بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو گئے، مگر آئینۂ خیال پر یہ اس قدر تازہ ہے جیسے آج بھی میں اسی عہد طفولیت میں ہوں اور مولانا کی شفقت اسی طرح سایہ فگن ہو، کاش کہ ایسا ہی ہوتا.....

ع لوٹ ماضی کی طرف اے گردش ایام تو

مدرسہ وصیۃ العلوم الٰہ آباد - کچھ یادیں

غالباً ۱۹۷۹ء کی بات ہے، جب میں حصول علم کے لئے مدرسہ وصیۃ العلوم الٰہ آباد میں داخل ہوا، میرے پھوپھی زاد بھائی مولانا محمد شعیب قاسمی (مقام بلہا ضلع سمستی پور بہار) وہاں کے قدیم طلبہ میں تھے، اس سے قبل حکیم محمد یعقوب صاحب (مقام بلہا ضلع سمستی پور بہار) وہاں سے پڑھنے بعد وہیں کسی ملازمت سے وابستہ ہو گئے تھے، یہی دونوں حضرات میرے وہاں پہونچنے کا ذریعہ بنے،..... حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے انتقال پر قریب دس سال کا عرصہ بیت چکا تھا، مگر لوگوں کے دل ودماغ پر اس طرح چھائے ہوئے تھے جیسے کہ ابھی بھی وہ موجود ہوں، حضرت کی خدمات وتعلیمات کے زندہ نقوش

وہاں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے، ان کا قائم کردہ ادارہ مدرسہ وصیۃ العلوم پورے شان وشکوہ کے ساتھ چل رہا تھا اور پورے خطۂ مشرق میں اس کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، طلبہ کا رجوع بھی تھا، اور لوگوں کی آمد ورفت بھی بہت تھی ..... آپ کے خلفاء، مریدین اور تیار کردہ افراد کی بڑی جماعت موجود تھی،..... ہر طرف آب وہوا میں روحانیت کی خوشبو رچی بسی تھی، حضرت کے بڑے داماد اور جانشین حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحبؒ خانقاہ کے سجادہ نشیں تھے، ان کے دم سے خانقاہ آباد تھی، ان کی مجلس میں قریب وبعید کے سالکین ومنتسبین بڑی تعداد میں شرکت کرتے تھے.....

الٰہ آباد پہلے بھی علم ودانش کی سرزمین رہا ہے، وہاں کا مدرسہ سبحانیہ ہندوستان کے مردم خیز اور افراد ساز اداروں میں شمار ہوتا ہے، جہاں سے مفکر اسلام، فقیہ النفس حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ بانی امارت شرعیہ بہار جیسی یگانۂ روزگار شخصیت پیدا ہوئی،..... مگر اب وہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے،..... حضرت قاری محمد حبیب صاحبؒ کا مدرسۂ حفظ وقرأت (کٹرہ) ابھی اپنی آن وبان باقی رکھے ہوئے تھا، قاری صاحبؒ اس وقت حیات سے تھے اور ان کی خدمات کو بڑے ہی قدر واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

کچھ عرصہ قبل حضرت شاہ صاحب کی خانقاہ سے قریب ہی مدرسہ بیت المعارف قائم ہو چکا تھا ،جو ابھی ابتدائی دور سے گذر رہا تھا، یہ مدرسہ حضرت شاہ صاحبؒ کے دوسرے داماد حضرت مولانا قمر الزماں صاحب الٰہ آبادی کی فکر وکاوش کا نتیجہ تھا، حضرت شاہ صاحبؒ کی حیات میں سارے لوگ ایک نقطہ پر سمٹے ہوئے تھے، آپ کے انتقال کے بعد سب بکھر کر بحر بے کراں بن گئے، مولانا عمار احمد صاحب الٰہ آبادی بھی اسی کہکشاں کا حصہ تھے، جو ٹوٹ کر پہلے بیت المعارف کی زینت بنے، پھر انہوں نے افضل المعارف کے نام سے خود اپنی ایک انجمن سجائی،..... اب تو اور بھی بہت سے چھوٹے بڑے مدرسے قائم ہو گئے ہیں لیکن میری طالبعلمی کے دور میں قابل ذکر مدرسہ صرف وصیۃ العلوم تھا۔

مدرسہ وصیۃ العلوم کی شان

اس کے معیار تعلیم کا اندازہ اس سے لگائیے کہ میں درجہ فارسی کا طالب علم تھا، ہم تقریباً پانچ

ساتھی تھے، ان میں ایک ذہین ترین ساتھی مولوی عبد العزیز تھے، ہم دونوں بے تکلف آپس میں فارسی میں باتیں کیا کرتے تھے، ہم لوگوں نے مہینوں آپس میں اردو میں بات چیت نہیں کی اور ہم اتنی رواں فارسی بولتے تھے کہ لوگوں کو رٹے ہوئے ہونے کا گمان ہوتا تھا، حالانکہ ایسی بات نہیں تھی، ہم لوگ بلا سوچے سمجھے روزمرہ کی ضروریات سے لیکر مختلف موضوعات پر بے ساختہ فارسی میں گفتگو کر سکتے تھے ، یہ تو فارسی کی استعداد کا معاملہ تھا..... کتابوں پر محنت ایسی ہوتی تھی کہ حفظ کی جانی والی تمام کتابیں اتنی ازبر یاد ہو جاتی تھیں کہ نماز کی طرح صف بستہ ہو کر تمام ساتھی ان کی بالاستیعاب تلاوت کر سکتے تھے اور بھولنے پر ہر ساتھی لقمہ دینے کی صلاحیت رکھتا تھا،..... اسی طرح فارسی اور عربی قواعد کو ذہن نشیں کرایا جاتا تھا،..... اور لغات والفاظ زیادہ سے زیادہ ذہن میں محفوظ کرائے جاتے تھے، اس معاملہ میں حضرت مولانا محمد عرفان صاحبؒ ناظم تعلیمات کو خاص ملکہ حاصل تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان خصوصیات کا حامل ادارہ نہ اس زمانہ میں وہاں کوئی تھا، اور نہ آج وہاں کسی ادارہ کے بارے میں ایسی خوش امیدی کا امکان ہے،

دیوبندی بریلوی کشمکش

☆ بریلویوں کا مدرسہ غریب نواز بھی کافی مشہور تھا اور مشتاق احمد نظامی صاحب کی وہاں بہت دھوم تھی، بریلویوں کے بڑے بڑے جلسے مدرسہ وصیۃ العلوم والی مسجد کے سامنے ہوتے اور کیا مجال کہ کوئی اسے خلل ڈال دیتا، اس میں وہ حضرات اپنی عادت کے مطابق علماء دیوبند کو اپنے تمسخر کا نشانہ بھی بناتے تھے، ایک دو جلسے میں نے بھی اپنے زمانہ میں سنے،..... دونوں مدرسوں میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا، اس لئے طلبہ میں بھی آپس میں مڈبھیڑ ہوا کرتی تھی ..... کبھی الٰہ آباد کے مشہور زمانہ "خسرو باغ" میں اس طرح کے مقابلے ہوتے تھے۔

میرے گھر کا خانقاہی مزاج

میں خالص خانقاہی ماحول سے وہاں گیا تھا، ہمارے یہاں اس طرح کی مسلکی منافرت کا کوئی چرچا نہیں تھا، اکثر ایک ہی فکر وعقیدہ کے لوگ تھے، میرے پڑدادا حضرت مولانا عبد الشکور آہؔ

مظفر پوریؒ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے تلمیذ خاص اور دارالعلوم دیوبند کے نامور فرزند تھے، اس سے قبل وہ حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ خلیفۂ اجل حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی شاگردی میں رہ چکے تھے اور کانپور میں لمبے عرصے تک ان سے استفادہ کیا تھا،..... میرے جد امجد قطب الہند حضرت مولانا الحاج حکیم احمد حسن منوریؒ شمالی و مشرقی بہار اور مغربی بنگال میں سلسلۂ نقشبندیہ کے ممتاز مشائخ میں تھے، ان کے منتسبین و مریدین میں دونوں طرح کے لوگ تھے، ان میں سے بہت سے لوگ جد امجد کے گذرنے کے بعد بھی منوروا آتے رہے، ان میں علماء بھی تھے، اور اکثر ایک مجلس اور ایک دسترخوان پر یہ لوگ جمع ہوتے اور سب پر ایک ہی رنگ چھایا ہوتا، اللہ کا رنگ، روحانیت کا رنگ..... مشرقی بہار اور بنگال کا علاقہ مسلکی منافرت کے معاملے میں کافی گرم مانا جاتا ہے، ادھر کے بعض حضرات اس حسین سنگم کو دیکھتے تو ازراہ تلطف پوچھ بیٹھتے کہ آپ حضرات کا مسلک کیا ہے؟... تو مسکرا کر جواب دیا جاتا، نقشبندیت.....

اس باب میں اتنا خوبصورت، محبت آمیز اور اعتدال پسند ماحول میں نے اپنے گھر کے علاوہ کہیں نہیں دیکھا اور یہ سب میرے جد امجدؒ کی اخلاقی و روحانی تربیت کے اثرات تھے،..... یہ روایت ہمارے گھر اور حلقے میں بہت دنوں تک باقی رہی، میرے والد ماجد حضرت مولانا سید محفوظ الرحمن صاحب نقشبندی دامت برکاتہم بھی اسی فکر و مزاج اور نقطۂ اعتدال کے حامل ہیں، اصلاً دیوبندی الفکر ہونے کے باوجود دونوں ہی مکاتب فکر کے بزرگوں کا وہ احترام کرتے ہیں، انہوں نے اس طریق کار سے بہت سی بدعتوں کا خاتمہ کیا، شدت پسند گھرانوں کے بچوں کو دیوبندی مدارس میں بھیجا..... یہ سلسلۂ زریں اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ خود ان تبدیل شدہ گھرانوں کے نئے فضلاء نے شدت آمیز رویہ اختیار نہیں کر لیا،..... آج اس حکمت عملی کے فوائد محسوس ہوتے ہیں جبکہ اس کے مواقع ہماری نادانیوں کی وجہ سے جاتے رہے۔

مشرب صوفیاء

صوفیاء کبھی شدت و تنگ نظری کو جگہ نہیں دیتے، وہ ہمیشہ ایسے طرز عمل سے بچتے ہیں جو

خلق خدا میں نفرت وکشیدگی کا باعث ہو، اور جس سے عمل کے بجائے رد عمل کا جذبہ بیدار ہو، ان کے یہاں اصل مطلوب حق تک رسائی ہے اور اس کے لئے راستے مختلف ہوسکتے ہیں،..... ہر انسان کے احوال وظروف جداگانہ ہوتے ہیں جن کے فرق سے راستے بدلتے ہیں، یہ مجتہدین صوفیاء طے کرتے ہیں کہ منزل تک پہونچنے کے لئے کس مسافر کو کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے؟..... کبھی مسافر اپنے راستے کے انتخاب میں غلطی کر سکتا ہے، لیکن صوفیا اسے مطعون کرنے بجائے اسے معذور رکھتے ہیں، ان کی نگاہ اس کے جذبہ وارادہ کی معصومیت پر ہوتی ہے،..... ان کے اس طرز عمل سے بہتوں کو ہدایت مل جاتی ہے، اس لئے کہ دنیا کے اکثر لوگ محبت کے اسیر ہیں، نفرت وانتقام ایک وقتی اشتعال ہے، جو کسی رد عمل کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے اور پھر وقت کے گذرنے کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے۔

علاوہ صوفیا کی نظر مشاہدات کے تنوع پر نہیں بلکہ مشہود کی وحدت پر ہوتی ہے، وہ ہر چیز میں مشاہدۂ ذات کرتے ہیں اس لئے ہر فکر ونظر کے انسان ان کو ایک ہی منزل کے مسافر محسوس ہوتے ہیں، راستے کے فرق سے منزل میں فرق نہیں پڑتا، وہ طریق کے اختلاف کو اختلاف منزل پر نہیں بلکہ اختلاف احوال پر محمول کرتے ہیں، احوال کا فرق مٹ جائے تو راستے کا فرق بھی مٹ جائے گا۔

ایک چرواہے کا قصہ

مولانا جلال الدین رومیؒ صوفیانہ افکار وخیالات اور حقائق تصوف کے سب سے مستند ترجمان مانے جاتے ہیں، انہوں نے مثنوی معنوی میں ایک کمبل پوش چرواہے کا قصہ نقل کیا ہے، جو اپنے رب سے ہمکلام تھا..... حضرت موسیٰؑ نے پہاڑ سے اترتے ہوئے اس فقیر کو منہ نیچے کر کے بڑبڑاتے ہوئے دیکھا تو قریب جاکر سننے لگے، اس نے اپنے علم وعقل کے مطابق اللہ پاک سے اظہار محبت کے لئے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا تھا وہ شریعت کے ظاہری قانون سے ہم آہنگ نہیں تھا، حضرت موسیٰؑ نے اسے ٹوکا تو وہ خوف سے کانپنے لگا، ایک ضرب لگائی اور اپنی بھیڑوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا جنگل کی طرف نکل گیا،..... نظر سے اوجھل ہونے کے بعد آسمان سے آواز آئی کہ اے موسیٰؑ! یہ آپ نے کیا کیا؟ آپ نے میرے ایک چاہنے والے بندے کو مجھ سے الگ کر دیا، آپ کو ہم نے دنیا میں توڑنے کے لئے نہیں جوڑنے کے

لئے، بھگانے کے لئے نہیں ملانے کے لئے بھیجا ہے:

تو برائے وصل کردن آمدی
نہ برائے فصل کردن آمدی

ہم نے حق تک پہونچنے کے لئے ہر ایک کو اس کے ظرف کے مطابق الگ الگ راستے دیئے ہیں:

ہندیاں را اصطلاحے دادہ اند
سندھیاں را اصطلاحے دیگرند

اے موسی! اہل دانش کے آداب اور ہیں، اور سوز عشق میں جلے بھنے لوگوں کا طریق اور.....:

موسیا! آداب داناں دیگرند
عاشقاں سوز دروناں دیگرند

موسیٰ! مذہب عشق کے انداز نرالے ہیں، لیکن اصل مقصود اتصال حق اور خدا رسیدگی ہے:

مذہب عشق از ہمہ ملت جدا ست
عاشقاں رامذہب وملت خداست

ہاتف غیبی کی آواز پر حضرت موسیٰؑ کو تنبہ ہوا، وہ اللہ سے معافی کے خواستگار ہوئے، آسمان سے آواز آئی جا! میرے بندہ کو تلاش کر اور اسے خوشخبری سنا کہ تیری ساری ادائیں اللہ کو پسند ہیں اور تیری ساری خطائیں اللہ کی طرف سے معاف ہیں، حضرت موسیٰؑ اس کی تلاش میں نکلے، بہت دنوں کے بعد وہ کہیں جنگل میں اکیلا کھڑا ہوا دکھائی دیا، حضرت موسیٰ نے اس کو خوش خبری سنائی، مگر اب تک وہ

ہزاروں سال کا فاصلہ طے کر کے آگے جا چکا تھا اور خود کو مٹا کر خون دل میں لتھڑا پڑا تھا:

من ہزاراں سال زاں سو گشتہ ام
من کنو در خون دل آگشتہ ام

معصوم بچپن کی دعا

بہر حال میں جس ماحول کا پروردہ تھا اس کے لحاظ سے مجھے الٰہ آباد میں بڑی اجنبیت محسوس ہوئی، میری عمر بہت چھوٹی تھی، میرا شیشۂ ذہن بہت کچا تھا، میں پریشان ہوا کہ ایک دستر خوان اور ایک مصلیٰ پر اٹھنے بیٹھنے والے لوگ یہاں باہم دست و گریبان کیوں ہیں؟..... خدا شاہد ہے مجھے طلبہ کی اس جنگ میں کبھی دلچسپی نہیں رہی، البتہ معصوم دل کے اضطراب نے اللہ پاک سے یہ فریاد ضرور کی کہ پروردگار! جس طریق سے تو راضی ہے، وہ راہ حق مجھ پہ منکشف فرمادے،.....اور مجھے یقین ہے کہ معصوم لمحوں کی میری چند دعائیں جو اللہ پاک کے یہاں قبول ہوئیں ان میں ایک یہ بھی ہے،..... بعد میں جو حالات پیدا ہوئے، اور میرا رجحان جس تصلب کے ساتھ علوم قاسمیہ اور افکار دیوبند کی طرف منتقل ہوا اس میں اس قبولیت کے صاف آثار محسوس ہوتے ہیں۔

قافلہ سوئے دیوبند

میرے قیام الٰہ آباد کے زمانہ ہی میں دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس ہوا، قافلوں کے قافلے ادھر سے گذر رہے تھے، اجلاس کے لئے مستقل ٹرینیں چلائی گئی تھیں، ایک قافلہ الٰہ باد سے بھی گیا تھا، اس کے قائد حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحبؒ تھے، اس موقعہ پر مدرسہ وصیۃ العلوم کے ایک مؤقر استاذ حضرت مولانا نعمان الدین صاحب معروفیؒ نے ایک تہنیتی نظم کہی تھی، اس کا ایک شعر آج بھی مجھے یاد ہے:

قافلہ جارہا ہے سوئے دیوبند
میر اس کے ہیں "قاری مبین" دیکھئے

لکڑی کی کھڑاؤں

الٰہ آباد میں میرا قیام قریب دوسال رہا، پہلے سال میری کوئی کتاب مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ صاحب کے پاس نہیں تھی، میں فارسی جماعت کا طالب علم تھا اور وہ اس سے اونچی جماعتوں کو پڑھاتے تھے، البتہ ان کے علم وذہانت اور قوت حافظہ کی شہرت سے دل بہت مرعوب تھا، ان کی قربت سے خوف محسوس ہوتا تھا، پھر وہ خانقاہ میں رہتے تھے اور میں مدرسہ کی مسجد کا حجرہ نشیں، یہاں حضرت مولانا نعمان الدین اعظمیؒ ہمارے نگراں وسرپرست تھے، اس لئے کہ دارالاقامہ میں وہی رہتے تھے،.....ان کا کمرہ مسجد سے متصل بالائی حصہ پر تھا، وہ نیچے اوپر آنے جانے کے لئے لکڑی کی کھڑاؤں کا استعمال کرتے تھے،.....ان کے کھڑاؤں کی آواز عالم خیال میں آج بھی میری سماعت کے لئے فرحت بخش ہے،.....ان کو نہ چھڑی کی ضرورت تھی اور نہ کسی آلۂ تنبیہ کی، ان کی کھڑاؤں کی آواز ہی مضراب کا کام کرتی تھی، یہی آواز صبح کو بیداری کا الارم بن جاتی اور اسی ساز پر پانچوں وقتوں کے نمازی مسجد کے لئے بھی دوڑ پڑتے تھے،..... کسی کھڑاؤں کا اتنا بہتر استعمال میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا،.....

کہکشاؤں کی ایک انجمن

میرے اساتذہ میں اس وقت مولانا نعمان الدین صاحبؒ کے علاوہ حضرت مولانا عبدالرحمن جامیؒ، حضرت مولانا نورالہدیٰؒ (چھوٹے داماد حضرت شاہ وصی اللہؒ صاحب)، حضرت مولانا انوار احمد صاحبؒ، حضرت مولانا قاری ارشاد احمد صاحبؒ، حضرت مولانا عرفان احمد صاحبؒ (داماد حضرت قاری مبین احمد صاحبؒ) تھے، یہ سب حضرات اپنی اپنی جگہ علم وفن کے آفتاب وماہتاب اور زہد وتقویٰ میں باکمال تھے.....

آج مدارس میں جو قحط الرجال ہے اس کے تناظر میں دیکھتا ہوں تو جیسے یہ کہکشاؤں کی انجمن

تھی جو وقت کے گذرنے کے ساتھ گم ہو گئی۔

اساتذہ کی محبت وعقیدت

اس وقت کے طلبہ میں اساتذہ کا جو احترام پایا جاتا تھا وہ آج افسانہ معلوم ہوتا ہے، ہم لوگ اپنے اساتذہ کی جوتیاں سیدھی کرنے میں جو شرف محسوس کرتے تھے وہ شاید قارون کا خزانہ ملنے پر بھی محسوس نہ ہوتا،.....مجھے خوب یاد ہے صبح کی نماز میں ایک بار مجھے حضرت قاری مبین صاحبؒ کی جوتیاں اٹھانے کا موقعہ مل گیا اور قاری صاحب نے از راہ شفقت میرے سر پر ہاتھ رکھے اور شاید چار آنہ پیسے بھی عنایت فرمائے،.....اس کی لذت وفرحت کا احساس ہفتوں تک مجھے رہا، اس کے بعد پھر کبھی اس کا موقعہ نہ مل سکا..... قاری صاحب اکثر سفر میں ہوتے تھے، یا الٰہ آباد میں ہوتے بھی تو ان کے خدام کی کمی نہیں تھی،.....ان کے چلنے کا انداز اور ان کا والہانہ پن آج بھی جیسے نگاہوں کے سامنے ہو۔

میں نے جو خانقاہ دیکھی تھی.....

قاری صاحبؒ بڑے شان وشکوہ والے بزرگ تھے، کسی خانقاہ میں کروفر اور خدام وعشاق کا ہجوم میں نے پہلی بار یہیں دیکھا، میں نے اپنے گھر میں جو خانقاہ دیکھی تھی اس میں مرید مراد اور خادم مخدوم نظر آتے تھے، ہم لوگوں کو مہمانوں کی خدمت پر اس طرح مامور کیا جاتا تھا جیسے ہم ان کے شیخ زادے نہیں بلکہ زر خرید غلام ہوں، پیر طریق بھی اپنی وضع قطع، رہن سہن، اور طرز زندگی میں اتنے سادہ ہوتے کہ ان کے مرید ہی ان سے زیادہ باوجاہت نظر آتے، یہاں نہ کوئی ہٹو بچو تھا اور نہ قیام و احترام، نہ کسی باقاعدہ مجلس کا اہتمام، نہ شیخ طریق سے ملنے کے لئے وقت کی پابندی، نہ سفر کے لئے کسی قسم کا اعلان واہتمام، جب ارادہ ہوا ایک تھیلا ہاتھ میں لیا اور روانہ ہو گئے، کوئی رفیق مل گیا تو بہتر، ورنہ اکیلے ہی چل پڑے، نہ سواری، نہ موٹر کار، دیہات دیہات پیدل یا سائیکل یا زیادہ سے زیادہ بیل گاڑی سے سفر ہوتا تھا، ایک عام سی زندگی جس میں بظاہر کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں ہوتی، نہ اپنا کام کرنے میں تکلف، نہ دوسروں کا بوجھ اٹھانے میں کوئی عار، کوئی امتیاز نہیں کر سکتا کہ ان میں پیر طریق کون ہے؟.....

خانقاہ وصی الٰہی کا مسند نشیں

لیکن الٰہ آباد میں جب قاری صاحبؒ کی خانقاہ دیکھی تو میرے معصوم ذہن نے فیصلہ کیا آج کے دور میں پیر کی یہی شان ہونی چاہئے، میں نے دیکھا قاری صاحب کا ہر کام ٹکے بندھے اصولوں کے مطابق ہوتا ہے، ہمارا ایک درس حضرت مولانا عرفان صاحب سے متعلق تھا اور وہ خانقاہ ہی کے ایک کمرہ میں پڑھاتے تھے، اس لئے خانقاہی معمولات کے مشاہدہ کا براہ راست موقعہ ملتا تھا، مجلس میں بھی کبھی کبھار حاضری ہوتی تھی، اس وقت الٰہ آباد میں اتنی آباد خانقاہ کوئی بھی نہ تھی، اور نہ اس درجہ عوام و خواص کا اعتقاد واعتماد کسی کو حاصل تھا، قاری صاحب سفر میں جاتے تو خواص کی بڑی تعداد رخصت کرنے جاتی، اور جب سفر سے واپس ہوتے تو اسٹیشن پر استقبال کرنے والوں کا ہجوم ہوتا، ایک آدھ بار مجھے بھی اس طرح کے مواقع پر اسٹیشن حاضری کا موقعہ ملا، اور لوگوں کے اژدحام کی وجہ سے میں مصافحہ کی سعادت سے محروم رہا۔

حالانکہ اس وقت الٰہ آباد میں ممتاز نقشبندی بزرگ حضرت مولانا محمد احمد پرتابگڈھیؒ بھی موجود تھے، مگر میری حرماں نصیبی کہ میں نے دوسالوں میں کسی سے ان کا تذکرہ بھی نہیں سنا، حضرت مولانا قمر الزماں صاحب کا نام ایک بڑے عالم دین اور حضرت شاہ صاحبؒ کی دامادی کی نسبت سے سنا کرتا تھا،.....اس وقت ان کی طرف لوگوں کا رجوع بالکل نہیں تھا، بلکہ وہ خود حضرت پرتابگڈھیؒ کی دکان معرفت کے خریداروں میں تھے،..... مولانا عمار صاحب مدرسہ بیت المعارف میں استاذ تھے، ان کی الگ سے کوئی پہچان نہیں تھی، غرض اس وقت کا منظر میرؔ کے الفاظ میں:

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

اس وقت وہاں خانقاہ وصی الٰہی کے علاوہ کوئی دوسری خانقاہ نہیں تھی اور وصیۃ العلوم کے سوا کوئی دوسرا مدرسہ نہیں تھا، ہر چراغ کو اسی چراغ سے روشنی لینی تھی، ہر خریدار محبت کو اسی دکان سے

سودائے دل لیناتھا، ہر دل میں اسی مرد درویش کی محبت جاگزیں تھی جو خانقاہ وصی الٰہی کا مسند نشیں تھا،.....

ایک شیخ نقشبند.....

یہ اس دور کا الٰہ آباد ہے جسے میں نے اپنے پڑھنے کے زمانے میں دیکھا ہے، بعد میں اس کا نقشہ ہی بدل گیا، کئی گمنام شخصیتوں کو بام عروج پر پہونچتے دیکھا، حضرت پرتا بگڈھیؒ کی شخصیت شہرۂ آفاق بن گئی، ان کی دکان محبت کا چرچا اتنا عام ہوا کہ الٰہ آباد میں رہ کر مجھے ان کی زیارت کی توفیق نہ ہو سکی، لیکن دیوبند سے عزم سفر کرکے صرف ان کی زیارت کے لئے الٰہ آباد حاضر ہوااور اس کی تحریک حضرت الاستاذ مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ سابق مفتی دارالعلوم دیوبند کے سفر سے ہوئی، الٰہ آباد میں حضرت شاہ وصی اللہؒ کا دور ایک بار پھر تازہ ہو گیا تھا، یہ شہر پھر مرجع عوام وخواص بن گیا تھا، ہندوستان کی کون سی بڑی یا چھوٹی علمی یا روحانی شخصیت تھی جس کو حضرت پرتاب گڈھیؒ کی محبت اس شہر میں کھینچ کر نہیں لائی، جس کو دیکھو ان کی محبت میں کشاں کشاں چلا آرہا تھا، حضرتؒ کی زندگی کا وہ عہد اخیر تھا جب ان کی شخصیت کے آگے ہندوستان کے تمام مشائخ وخانقاہوں کی عظمتیں سرنگوں ہو گئی تھیں، اور ہر شخص ان کا مداح اور ثناخواں نظر آتا تھا،.....

ان کے بعد حضرت مولانا قمر الزماں صاحب کی خانقاہ بھی کافی آباد ہوئی،.....اور حضرت مولانا عمار صاحب کا بھی سلسلۂ بیعت وارشاد جاری ہوا.....

مولاناؒ خانقاہ وصی الٰہی میں

ہمارے مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کو شروع سے ہی مشائخ چشت اہل بہشت سے طبعی مناسبت تھی، اس لئے غالباً وصیۃ العلوم کی ملازمت کے دوران وہ حضرت قاری محمد مبین صاحب سے بیعت ہو گئے، مولانا قاری صاحبؒ کی اکثر مجالس میں صف اول کے حاضر باشوں میں ہوا کرتے تھے، مولانا کی درسگاہ خانقاہ میں مجلس کی جگہ سے متصل ہی ایک کمرہ میں تھی، اس لئے بھی ان کو صحبت شیخ کے مواقع زیادہ حاصل تھے، شیخ کے حضور مولانا کی تواضع ومسکنت اور ایثار وانکسار قابل دید ہوا کرتی تھی، علاوہ

ازیں اوراد واشغال کا جو اہتمام مولانا کے اندر دیکھنے میں آتا تھا، وہ مولانا کی بے نفسی اور زاہدانہ زندگی کی علامت تھی، طلبہ مولانا کے علم کے ساتھ ان کے زہد وتقویٰ کے بھی معترف ومداح تھے۔

اگلے تعلیمی سال (۱۹۸۰ء) میں ہمارے درجہ (عربی اول) کی ایک کتاب (نحومیر) مولانا کے زیر درس آئی اور اس طرح پہلی بار ان کے حلقۂ تلمذ میں داخلہ کی سعادت ملی، لیکن مولانا کے رعب کی بناپر ان سے بہت زیادہ قربت وانس پیدا نہیں ہوا، ایک تو مولانا کے رعب کی دہشت تھی دوسرے وہاں کے ماحول میں مولانا تنہا محسوس کئے جاتے تھے اور بہت سے طلبہ چاہنے کے باوجود بھی ان سے قریب نہیں ہوپاتے تھے،..... مولانا درس اور صحبت شیخ کے علاوہ باقی تمام اوقات اپنے کمرہ کے اندر لکھنے پڑھنے میں گذارتے، میں اس وقت لکھنے پڑھنے کے مفہوم سے ناآشنا تھا، بلکہ مدرسہ میں عام طور پر اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی، اسی لئے وہاں اکثر طلبہ علمی قابلیت کے باوجود میدان قلم کے شہسوار نہیں تھے اور نہ مولانا کی اس صلاحیت کی کوئی خاص پذیرائی تھی..... وہ تو ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ مولانا نے وہاں رہ کر کیسی کیسی قلمی کاوشیں کیں۔۔۔

قلم وکتاب مولانا کی تنہائی کے رفیق تھے، اہل وعیال سے جو وقت بچ جاتا وہ لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے، کبھی ان کو مجلس بازی، سیر وتفریح اور لایعنی مشاغل میں نہیں دیکھا گیا، وہاں کے جوان اساتذہ میں ایسی پابند اور محتاط زندگی گذارنے والا کوئی نہیں تھا،..... کئی لوگ اس کو زاہدانہ تقشف گردانتے تھے، مگر حقیقت یہ تھی کہ یہ صرف اپنا تحفظ تھا، مولانا کے لئے وہاں کوئی محرم اسرار ہی نہیں تھا جو ان کا ہم رشتۂ درد ہوتا:

اقبالؔ اپنا محرم کوئی نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

ان کی یہ تنہائی صرف اس وقت ٹوٹتی تھی جب مدرسہ یا خانقاہ میں کوئی صاحب علم یا صاحب دل آجاتا تھا، پھر وہ اپنی خلوت سے نکل آتے تھے اور ایک مجلسی شخص کی طرح ان کے ساتھ بیٹھتے، علم

وحکمت اور اسرار ورموز کی باتیں کرتے .....مثلاً الٰہ آباد کے ایک گاؤں (غالباً اتراواں) سے حضرت مولانا محمد فاروق صاحبؒ خانقاہ میں تشریف لاتے تھے،ان کا علم وفضل زبان زد تھا،بڑے محقق اور صاحب تصنیف عالم تھے،حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے متوسلین میں تھے بلکہ غالباً اجازت یافتہ تھے،ہمارے مولانا کو ان سے بڑی مناسبت تھی،ان کے ساتھ اکثر بیٹھا کرتے تھے۔

میرے والد ماجد کی الٰہ آباد آمد

اسی اثنا کا ذکر ہے کہ میرے والد ماجد اپنے ایک رفیق سفر جناب عبدالرؤف صاحب مرحوم (لوٹیاباری ضلع پورنیہ) کے ہمراہ اچانک الٰہ آباد وارد ہوئے،وہ دہلی اور سرہند کے ارادہ سے نکلے تھے، درمیان میں ہم بھائیوں کی محبت میں الٰہ آباد اتر گئے،پہلے سے ہمیں اس کی کوئی اطلاع نہیں تھی،.....میں اس زمانے میں حضرت قاری مبین صاحبؒ کے گھر کا خادم تھا،کمسنی کی وجہ سے میرا انتخاب اس کے لئے کیا گیا تھا اور اپنی بے شعوری کے باوجود میں اس کو اپنی سعادت سمجھ کر انجام دیتا تھا.....والد صاحب کی آمد کی خبر ملی تو میں اس وقت قاری صاحب کی حویلی میں تھا،میں بھاگا ہوا حاضر ہوا،والد صاحب مدرسہ والی مسجد میں تھے،والد صاحب نے دو دن قیام فرمایا،.....والد صاحب قاری صاحبؒ سے ملنے کی غرض سے خانقاہ تشریف لے گئے،وہاں مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ اپنی درسگاہ میں پڑھا رہے تھے،ہم لوگوں کا سبق اس کے بعد ہی تھا، قاری صاحب سے ملاقات کے بعد والد صاحب کے قدم ناگاہ ان کی درسگاہ کی طرف مڑ گئے،مولانا سے کوئی شناسائی نہیں تھی،ہم دونوں بھائی بھی مولانا کے لئے ایک طرح سے اجنبی ہی تھے،لیکن نہ معلوم مولانا پر کس کیفیت کا غلبہ ہوا کہ انہوں نے سبق بند کر دیا اور طلبہ کو رخصت کر دیا، دیر تک دونوں حضرات طریقت وتصوف کے موضوع پر بات چیت کرتے رہے،..... حکیم یعقوب صاحب جو اس مدرسہ کے ابن قدیم رہے ہیں اور اس وقت کسی گورنمنٹ لائبریری میں ملازم تھے،والد صاحب کے ہمراہ تھے،ان کا بیان ہے کہ کسی شخص کے لئے انہوں نے پہلی بار اپنے معمولات ترک کئے، .....پھر والد صاحب کو ہمراہ اپنے کمرہ لے گئے اور دو دنوں تک کی پوری ضیافت اپنے گھر سے انجام دی،اس دوران اکثر ان دونوں بزرگوں کو باہم محو گفتگو دیکھا گیا،بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ مولانا

اکثر سراپا گوش نظر آئے،.....

مولانا اعجاز احمد اعظمی ہمارے جد اکبر حضرت مولانا عبد الشکور آہ مظفر پوریؒ کے نام سے واقف تھے، انہوں نے ان کا نام دار العلوم مئو کے مشائخ حدیث کی فہرست میں دیکھا تھا، مگر اس نسبت سے وہ ہمیں نہیں جانتے تھے، والد صاحب سے پہلی ملاقات میں بھی اس کا ذکر نہیں آیا،..... غرض تاریخی مکمل اجنبیت کے باوجود مولانا قیام الٰہ آباد کے دوران والد صاحب سے اس قدر متأثر ہوئے کہ نہ صرف یہ کہ دو دنوں کی پوری خدمت وضیافت اپنے ذمہ لی، بلکہ ریلوے اسٹیشن تک خود رخصت کرنے گئے، ٹرین لیٹ تھی تو ڈیڑھ دو گھنٹے اسٹیشن پر ساتھ رہے اور اس دوران بھی مسائل طریقت ہی پر باتیں کرتے رہے۔

منورواتشریف آوری اور مکاتبت

ہم تو اس وقت نادان تھے، لیکن بعد میں والد صاحب اور کچھ مولانا کے خطوط کے ذریعہ اس کی تھوڑی تفصیل معلوم ہوئی،..... مولانا کے اس دور کے کچھ خطوط آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہیں، جب مولانا جستجوئے معرفت میں کافی حیران وسرگرداں نظر آتے تھے..... اسی سال مولانا نے رجب المرجب کے آخری ہفتہ میں بہار کا سفر اختیار کیا، اور ہمارے یہاں ۲۸/ رجب ۱۴۰۱ھ کو احباب طریق کی مجلس میں شرکت فرمائی، مولانا نے یہاں دو شب قیام فرمایا، ہم لوگ تو خدام تھے، ہمیں ہم نشینی کا شرف کم ہی ملا، لیکن مولانا کے جذبہ وشوق کی وارفتگی ہم نادانوں سے بھی مخفی نہیں رہ پائی، مولانا نے یہاں سے واپسی پر والد محترم کو اپنے پورے سفر کی تفصیل لکھی، اور غالباً یہ پہلا خط ہے جو مولانا نے الٰہ آباد سے والد صاحب کو تحریر فرمایا ہے، خط ڈیڑھ صفحہ پر مشتمل ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ”مخدومی ومکرمی! یہ تو سفر کی روداد تھی جو میں نے اپنی طبیعت کے خلاف اتنی تفصیل سے لکھدیا تاکہ آپ کو پورا اطمینان حاصل رہے، لیکن حاصل سفر وہی چند لمحات تھے، جو آپ کی صحبت میں بسر ہوئے، میں تو اندھا ہوں اور بے حس بھی، کسی طرح کا ادراک واحساس قطعاً کچھ نہیں ہوا، لیکن مجھے امید ہے کہ نیکوں

کی صحبت رنگ ضرور لائے گی، میرے ساتھ تو "سنگ بے نمک لیسیدن "والا مضمون ہے، اکثر مجھے اپنی حالت پر افسوس ہوتا ہے، کہ ہائے عمر کا کچھ حاصل نہیں، جس قدر عمر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، گناہ بڑھتے ہی جاتے ہیں، کمیت میں بھی اور کیفیت میں بھی، آپ جیسے حضرات کی صحبت میں رہ کر یہ احساس اور بڑھ جاتا ہے کہ نیکوں کی پرواز کتنی اونچی ہے، میں غریب اندھا، لنگڑا، اپاہج، بے ہمت، کام چور، دن بدن خراب وبدحال ہی ہوتا جارہا ہوں، پرواز ہے مگر معکوس ومنکوس، معلوم نہیں میرے بارے میں خدا کو کیا منظور ہے، اگر میری رسوائی وعذاب ہی منظور ہے -خدا کرے ایسا نہ ہو -تو میرا بند بند کانپ جاتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے اپنے اوپر سب سے زیادہ اندیشہ مردودیت ومطرودیت ہی کا ہے، کیونکہ میری معصیتیں حد سے فزوں تر ہیں، اور گستاخی وبے ادبی مزید، لیکن پھر غور کرتا ہوں تو خدا کی شان رحمت وعنایت ہاتھ پکڑتی ہے، کہ بندے مایوس نہ ہو -اب اللہ والوں سے بجز اس کے کیا عرض کروں کہ وہ خدا کے حضور اس بندہ کے متعلق یہی درخواست پیش کریں کہ مردودیت سے بچایا جاؤں، آپ حصرات کی محبت دیکھتا ہوں تو ڈھارس ہوتی ہے کہ دنیا میں آپ نے محبت کی نظروں سے دیکھا ہے، تو امید ہے کہ آخرت میں بھی آنکھیں نہ پھیریں گے -اے کاش میں کوئی جانور ہوتا جسے جنون محبت کی گرانباریوں سے نجات ہوتی، ہائے ہائے دل بیٹھا جاتا ہے،، طبیعت گھبرانے لگتی ہے، آپ میرے لئے صدق دل سے دعاتو کرتے ہی ہیں مگر مکرر درخواست کرتا ہوں کہ للہ اور توجہ کیجئے، اس غریق بحر ظلمات کو ہاتھ پکڑ کر نکالئے، حضرات نقشبندیہ تو غائبانہ توجہ کے ذریعے بھی سالک کو چلاتے رہتے ہیں[3]

---

[3] -۴/ شعبان ۱۴۰۱ھ

مولانا کی یہ اضطرابی کیفیت ایک دن کی نہیں تھی، بلکہ برسوں مولانا اس میں مبتلا رہے، ۱۴۰۵ھ کے ایک خط میں جب میں دیوبند جاچکا تھا والد صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

"مظہر صاحب (والد صاحب کے ایک قدیم مسترشد اور محرم راز، مقام بڑہروا ضلع سیتامڑھی بہار) نے میرے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس پر ضرور توجہ فرمائیں، آپ صاحب کشف ہیں، کاش کسی ذریعہ سے مجھے یہی معلوم ہو جاتا نسبت مع اللہ حاصل کرنے کے لئے کس آستانہ پر مجھے جانا چاہئے، طبیعت گو اندر سے پر سکون ہے، مگر ایک تشنگی اور پیاس معلوم ہوتی ہے، اب کے بہار کا سفر ہو گا تو گڑھول شریف جانے کی نیت ہے، اور منورواشریف بھی، آپ حضرات سے مل کر ایمان میں تازگی آجاتی ہے..... حق تعالیٰ آپ کو سلامت باکرامت رکھے[4]

۱۴۰۶ھ کے ایک خط میں اپنی بے قراری کا حال ان الفاظ میں تحریر فرمایا:

"ملاقات ہوئے بہت عرصہ ہو گیا، آپ ہی کھینچئے، تاکہ ملاقات ہو، میرا تو پروگرام بن بن کر فیل ہو جاتا ہے، آج کل تو کوئی پروگرام بھی نہیں ہے، آپ کے وجود سے بڑی ڈھارس ہے، طبیعت کو قوت رہتی ہے.....[5]

یہ خطوط جو سر دست مجھے ہاتھ آگئے، مولانا کے اس عہد کے کیف دروں کے عکاس اور ان کے اضطراب و بے قراری کے غماز ہیں، ..... ان کا سکوت ان کے اندر کے طوفان کا پیش خیمہ تھا، جسے اپنی منزل گم شدہ کی تلاش ہو اسے اپنے گرد و پیش کی کیا خبر؟ ..... لوگ اس خاموش مزاجی اور جنون محبت کی گرانباری کو جو نام دینا چاہیں دیں، مگر جس پر گذرتی ہے وہی اس کو بہتر طور پر جانتا ہے، مولانا ڈاکٹر کلیم عاجزؔ کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے، جو ان کے کرب دروں کا آئینہ دار تھا:

---

4 ۔ مکتوب ۱۵/ ذی قعدہ ۱۴۰۵ھ

5 ۔ مکتوب ۱۵/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۶ھ

تم تو جوانی کی مستی میں کھیل کے پتھر پھینک گئے
جس کو چوٹ لگی ہے پیارے اس کا ہی دل جانے ہے

بہر حال بات چل رہی تھی والد صاحب کی الٰہ آباد آمد کی، والد صاحب کی آمد کے بعد ہم لوگ مولانا کی باقاعدہ سرپرستی میں داخل ہوگئے، اس کے بعد ہم دونوں بھائیوں کا بوریہ بستر مسجد کے کمرہ سے ہٹا کر خانقاہ کے خام مکان میں منتقل کر دیا گیا اور پھر ہمارے پیسے مولانا کے پاس جمع رہنے لگے ،جب ہم لوگوں کو ضرورت ہوتی مولانا سے مانگ لیتے، نہ والد صاحب نے بتایا کہ کتنے پیسے مولانا کے پاس جمع کئے ہیں؟ اور نہ مولانا نے کبھی منع کیا، جب ضرورت ہوئی ان سے رقم حاصل کرلی، البتہ وہ ضرورت کی تفصیل ضرور معلوم کرتے تھے۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ والد صاحب سے ملاقات کے بعد مولانا میں غیر محسوس طور پر تبدیلی آئی، ان کا سکوت ٹوٹا، اور ان کی آنکھوں میں امید کی رمق جاگنے لگی، پہلے سفر سے گھبراتے تھے، اب شوق رہ نوردی سے مجبور ہوگئے، پہلے گرد و پیش سے بے خبر تھے اب چہار طرف سے باخبر رہنے لگے۔

اب یہ یاد نہیں کہ کیا بات ہوئی جو ہم لوگ اپنا یہ تعلیمی سال پورا ہونے سے پہلے ہی واپس وطن آگئے، (شاید کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا) رجب کے اواخر میں مولانا منوروا تشریف لائے، والد صاحب کو انہوں نے اپنے پروگرام کی اطلاع دی اور اگلے تعلیمی سال (۱۴۰۱ھ، ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۱ء / ۱۹۸۲ء کے لئے میرا قرعۂ فال مدرسہ دینیہ غازی پور کے لئے نکل گیا۔

۲۴ / رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ کو والد صاحب کے نام مولانا کا خط آیا جس میں الٰہ آباد سے اپنی علٰحدگی واستعفا، اور مدرسہ دینیہ غازی پور پہونچنے کی اطلاع دی گئی تھی اور والد صاحب مدظلہ سے غازی پور آنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا گیا تھا، غالباً سب کچھ پہلے منوروا میں طے ہو چکا تھا، خط میں اسی کی یاد دہانی کرائی گئی تھی، اور یہ بھی درخواست کی گئی تھی کہ کم از کم دو تین دن کا وقت یہاں دیں۔

غازی پور میں ہمارے قافلہ کی آمد

چنانچہ عید کے بعد ۱۵/ شوال سے قبل ہی ہمارا قافلہ والد ماجد کی قیادت میں غازی پور کے لئے روانہ ہو گیا، جس میں والد صاحب کے چار احباب جناب حاجی مظہر الحق صاحبؒ سابق اوڈیٹر (سیتامڑھی) ، جناب حاجی محفوظ الرؤف صاحبؒ (سابق رئیس کملپور اتر دیناجپور بنگال)، جناب ضیاء الحق صاحبؒ (سورجاپور بنگال)، جناب اکرم صاحب (سیوان) اور میرے علاوہ دو اور طلبہ انعام الحق (مقیم حال گجرات) اور شرافت ابرار (مقیم حال کلکتہ) شامل تھے، سب سے پہلے ہمارے سات (۷) رکنی قافلہ نے "شوکت منزل" میں پڑاؤ ڈالا..... اسی سال اس کا افتتاح بھی ہوا جس میں حضرت والد صاحب کی دعا پر مجلس کا اختتام پذیر ہوئی اور عربی درجات کو مرکز کی قدیم عمارت سے یہاں منتقل کیا گیا، عربی ہفتم کا اجراء بھی اسی سال ہوا..... اور ظاہر ہے کہ اس ترقی میں حضرت مولانا عزیز الحسن صدیقی صاحب دامت برکاتہم مہتمم مدرسہ کی دلچسپی کے علاوہ بڑا دخل حضرت مولانا اعجاز صاحبؒ کی شہرت تدریس اور حسن اخلاق کا تھا، مجھے خوب یاد ہے کہ اس افتتاحی نشست میں حکیم یوسف صاحب مرحوم (جو مہتمم صاحب کے ہمدرد دواخانہ میں بیٹھتے تھے) نے ایک طویل تہنیتی نظم پڑھی تھی، جس کی ہر بند اس مصرعہ پر ٹوٹتی تھی:

ع مولوی اعجاز جب آئے الٰہ آباد سے

شوکت منزل- جہاں میری کتنی یادیں آسودۂ خواب ہیں

گنگا کے کنارے عرض مستطیل پر یہ پر شکوہ اور وسیع و عریض عمارت مدرسہ دینیہ کو جناب ڈاکٹر شاہ شوکت اللہ انصاریؒ (سابق سفیر ہند متعینہ سوڈان) کی بیوہ محترمہ زہراء بیگم انصاری صاحبہؒ اور ان کے صاحبزادگان کی طرف سے ۱۳۹۸ھ میں ہبہ کے طور پر حاصل ہوئی، لیکن مرمت اور ضروری تیاریوں کے بعد اس میں عربی درجات کا افتتاح شوال ۱۴۰۱ھ میں ہوا، یہ رہائشی طرز کی عمارت تھی جو پہلے امراء اور نوابان اپنے لئے بنوایا کرتے تھے، کئی چھوٹے بڑے صحن، بہت سے کمرے، گیلریاں اور دالان وغیرہ، انتہائی پر فضا مقام، پوری عمارت اس خوبصورتی سے بنائی گئی تھی، کہ ہر طرف سے گنگا کی

موجوں کا نظارا کیا جاسکتا تھا اور اس کی جانب سے آنے والی تازہ ہواؤں سے لطف اندوز ہوا جاسکتا تھا، ..... گیلری میں یا مدرسہ کی چھت پہ کھڑے ہوں تو گنگا کی حد نگاہ سطح آب پر ابھرتی ہوئی موجیں سمندر کا سماں پیش کرتی ہیں، میرا شعور اتنا بلند نہیں تھا، پھر ندیاں اور تالاب ہمارے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی، ہمارا علاقہ دریاؤں کے سنگم میں واقع ہے، جس کو دریاؤں کی کثرت نے سہ آبہ میں تبدیل کر دیا ہے اور تقریباً ہر سال ہی یہاں کے لوگوں کو دریائی قہر وعتاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے، میری پیدائش ننہال میں ہوئی اور وہ وہاں عبور دریا کے بعد ہی پہونچا جاسکتا تھا، خود میرا گاؤں پہلے لب دریا (کرے ندی کے کنارے) واقع تھا، مگر دریا کی قہر سامانیوں سے تنگ آکر ۱۹۶۴ء میں پورے گاؤں کو باندھ کے دوسری طرف نسبتاً محفوظ مقام پر منتقل ہونا پڑا،..... یہ ندیاں قدو قامت میں مختصر ہونے کے باوجود انسانی آبادیوں کے لئے ایسی تباہ کن رہی ہیں کہ اکثر ان کے کنارے سے گذرتے ہوئے میں سوچا کرتا تھا:

اسی دریا سے اٹھتی ہیں وہ موج تند وجولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

مگر یہاں نہنگوں کے نشیمن نہیں انسانی آشیانے نشانہ بنتے تھے،.....

گنگا کا تاریخی ساحل

لیکن جب میں نے غازی پور میں دریائے گنگا کا سطح بے کراں دیکھا، تو ہمارے یہاں کی ساری ندیاں اس کے سامنے بے معنیٰ نظر آئیں، پھر جب مجھے معلوم ہوا کہ تقریباً پونے دو صدی قبل حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ کا قافلۂ قدس ادھر سے دوبار گذرا ہے، تو اس کی موجوں کے ساتھ میری عقیدت کا رشتہ بھی وابستہ ہو گیا،.....

"سید صاحبؒ ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۱۶ء میں سفر حج پر روانہ ہوئے تو آپ کا قافلہ زمانیہ ہوتے ہوئے ۱۱/ محرم الحرام ۱۲۳۷ھ کی صبح غازی پور پہونچا اور ۳۱/ محرم الحرام تک تین دن یہاں قیام کیا، پھر دو سال دس ماہ کے بعد جب آپ واپس

ہوئے تو چھ (٦) دن تک غازی پور میں قیام فرمایا، اور ان دونوں سفروں میں ہزاروں بندگان خدا کو اس چشمۂ ہدایت سے فیضیاب ہونے کا موقعہ ملا،..... تاریخ کا بیان یہ ہے کہ سید صاحب کو یہاں خوشبوئے دوست کھینچ لائی تھی، کہتے ہیں کہ جب سید صاحب کی کشتیاں عظیم آباد (پٹنہ)، داناپور ہوتے ہوئے رائے بریلی کے لئے روانہ ہوئیں اور بھوج پور، ہلسار، بھیرا اور بکسر ہوتے ہوئے محمد آباد پہونچیں تو آپ محمد آباد سے ایک دوسری طرف چل پڑے، لوگوں نے دریافت کیا تو کہا کہ مجھے دوست کی بو آتی ہے،..... یہ تھے یوسف پور کے نواب شیخ فرزند علی جو اس وقت بہت بیمار اور کمزور تھے انہوں نے یوسف پور میں آپ کا زبردست استقبال کیا، اپنے تمام اہل وعیال کو بیعت کرایا اور پھر آپ کی ہمراہی میں اپنے بچوں سمیت غازی پور کے لئے روانہ ہوئے، دوسرے دن یہ کشتیاں غازی پور کے ساحل پر آکر رکیں اور شیخ فرزند علی کے مکان (محلہ قاضی ٹولہ) پر سید صاحب نے اپنے قافلہ کے ساتھ مسلسل چھ (٦) روز تک قیام فرمایا، شہر کے لوگ بکثرت بیعت ہوئے، شہر کی جامع مسجد جو ویران ہوچکی تھی آباد ہوئی اور پانچ وقت پابندی کے ساتھ نماز ہونے لگی[6]

اور یہ ایک عجیب اتفاق یا نظام غیبی ہے کہ نواب فرزند علی نے اپنے اسی مکان سے متصل جہاں سید صاحب نے قیام فرمایا تھا ایک مسجد بھی بنوائی تھی، جس میں سید صاحب نے بھی غالباً نمازیں پڑھی ہونگی، اسی مسجد میں ایک سو چودہ سال کے بعد ۱۳۵۰ھ میں حضرت مولانا عمر فاروق قاسمیؒ (م ۱۳۶۳ھ) نے مدرسہ دینیہ کی بنیاد رکھی، پھر جب اس مدرسہ نے ترقی کی تو محلہ زیر قلعہ میں اس مقام پر

---

6 - سیرت سید احمد شہید ص ۳۷۲ مؤلفہ مولانا سید ابوالحسن ندویؒ و خصوصی شمارہ دین و دعوت ص ۸ تا ۱۰ مرتبہ مولانا عزیز الحسن صدیقی مہتمم مدرسہ دینیہ غازی پور

منتقل ہو گیا جہاں آج مدرسہ کی مرکزی عمارت موجود ہے[7]

مدرسہ کی مرکزی عمارت سے قریب ہی وہ اسٹیمر گھاٹ ہے جہاں غالباً سید صاحبؒ کی کشتیاں لنگر انداز ہوئی تھیں، قاضی ٹولہ محلہ بھی اسی سے متصل ہے،.....

☆ اسی گھاٹ پر عالم خیال میں میں نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کا قافلہ بھی اترتے ہوئے دیکھا، جن کا شہر کے بڑے مجمع نے استقبال کیا تھا، شیخ الہندؒ کی سواری کے گھوڑے کھول دیئے گئے اور خود اہل شہر نے اس سواری کو کھینچ کر منزل تک پہونچایا تھا، شیخ الہندؒ کا یہ تاریخی سفر قید مالٹا سے رہائی کے فوری بعد پیش آیا تھا[8]

غازی پور کی تاریخی اہمیت

شہر غازی پور پہلے بھی علم و علماء کا مرکز رہا ہے:

☆ ۱۸۶۲ء میں سر سید احمد خان صدر اعلیٰ بن کر آئے تھے، کہتے ہیں کہ وہ اپنے عظیم تعلیمی مشن کا آغاز اسی سرزمین سے کرنا چاہتے تھے، جیسا کہ ان کی بعض تعلیمی سرگرمیوں سے اندازہ ہوتا ہے، یہاں انہوں نے ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، اور اس سوسائٹی کے ذریعہ مغربی علوم کی اہم کتابوں کو ہندوستانی زبانوں میں منتقل کرنے کا پروگرام بنایا، یہیں دوران قیام انہوں نے تاریخ فیروز شاہی کی تکمیل کی، ایک رسالہ "التماس بہ خدمت ساکنان ہند در ترقی تعلیم" یہیں سے جاری کیا، تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علیٰ ملۃ الاسلام" (جس کی تصنیف وہ ۱۸۶۱ء ہی میں کر چکے تھے) کی پہلی جلد ۱۸۶۲ء میں غازی پور سے شائع کی، اس کتاب کو چھاپنے کے لئے انہوں نے ہزاروں روپے خرچ کر کے رڑکی سے پریس منگوایا تھا، اس سوسائٹی کے کوئی دو سو (۲۰۰) ہندو اور مسلمان ممبر تھے، جس میں غازی پور سمیت پورے ملک سے نمائندگی دی گئی تھی، یہیں انہوں نے تزک جہانگیری کا متن بھی لکھا اور اس کا ابتدائی حصہ یہیں چھپوایا..... یہاں انہوں نے ۱۸۶۴ء میں ایک مدرسہ کی بھی بنیاد ڈالی جو بعد

---

[7] - رسالہ دین و دعوت ص ۱۳، ۱۴

[8] - رسالہ دین و دعوت ص ۱۵

میں وکٹوریہ اسکول کے نام سے مشہور ہوا یہ ساری چیزیں اس سرزمین کے تعلق سے ان کے ارادوں کو بتاتی ہیں، لیکن تقدیر نے ان کو علی گڑھ پہونچادیا، اور ان کا مشن علی گڈھ تحریک کے نام سے مشہور ہوا[9]

☆غازی پور میں ایک مدرسہ چشمۂ رحمت کافی قدیم مانا جاتا ہے، جس کو ۱۸۶۹ء میں مولانا رحمت اللہ فرنگی محلیؒ نے قائم کیا تھا، کہتے ہیں کہ پہلے اس مدرسہ پر خیر کا غلبہ تھا، اور یہاں علماء حق کی بڑی تعداد رہتی تھی، (حوالۂ بالا) لیکن ہم نے جس دور میں اسے دیکھا وہ گورنمنٹ سے ملحق ایک زوال پذیر ادارہ تھا، اور بریلوی مکتب فکر کا نمائندہ تھا، اور وہاں محبت سے زیادہ نفرت کی تعلیم دی جاتی تھی۔

☆اسی طرح بقول صدیقی صاحب دامت برکاتہم:

"اردو کو علمی وادبی زبان بنانے کا پہلا کام اردو کی تاریخ میں اور ہندوستان بھر میں غازی پور ہی میں شروع ہوا تھا، اور یہ کام وقتی نہیں تھا، بلکہ براہ راست اسی تحریک کے زیر اثر آگے چل کر کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج وجود میں آیا، جان گل گرسٹ نیل کی کاشت کے سلسلہ میں ۱۷۸۲ء میں (فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے) غازی پور میں تھے، اور یہیں انگریزی اردو اور اردو انگریزی ڈکشنری تیار کی، ۱۷۹۰ء میں یہ لغت زیور طباعت سے آراستہ ہوئی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غازی پور کا ماحول علمی وادبی کاموں کے لئے ہمیشہ سازگار رہا ہے اور مختلف علوم و فنون سے وابستہ لوگ یہاں آتے جاتے رہے ہیں، ڈاکٹر علی شیر خان نے اپنے تحقیقی مقالہ "اردو ادب کے ارتقاء میں غازی پور کی خدمات" کے پیش لفظ میں اعتراف کیا ہے، کہ "دراصل غازی پور میں اردو شاعری کا آغاز سترہویں صدی میں ہوچکا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اردو زبان وادب اپنے ابتدائی مراحل سے گذر رہے تھے[10]

---

[9] -مشاہیر غازی پور ص ۸۵ تا ۸۷ مصنفہ مؤرخ کبیر مولانا عزیز الحسن صدیقی مہتمم مدرسہ دینیہ غازی پور

[10] -مشاہیر غازی پور ص ۹۱، ۹۲

غرض ملک السادات سید امیر مسعود غازی (م ۷۶۲ھ) کا یہ شہر غازی پور جس نے ۷۳۰ھ سے آج تک مسلسل سات صدیوں کی سینکڑوں بہاریں دیکھیں، علم و کمال کی بے شمار تاریخیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، کہتے ہیں کہ یہاں پر قریب میں (غوث پور کے مقام پر) کوئی پرانا تالاب تھا جہاں کا پانی بہت گدلا اور غلیظ تھا، لیکن راجہ "ماندھاتا چکویٰ" کا مرض جذام اسی گدلے پانی سے حیرت انگیز طور پر اچھا ہو گیا تھا، بس راجہ نے یہیں پر ڈیرا ڈال دیا، لیکن بعد میں اس کے ظلم و ستم اور عیاشیوں سے تنگ آکر دہلی کی شہنشاہیت کو اس کے خلاف قدم اٹھانا پڑا اور ملک السادات مسعود غازی کے ذریعہ اس فتنہ کا قلع قمع کیا گیا، پھر ملک السادات نے یہاں ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی، جو ان کی نسبت سے غازی پور کے نام سے مشہور ہوا، مسعود غازی کی قبر غازی پور کے محلہ سید راجے میں ہے جس کو اب محلہ ہری شنکر بولتے ہیں، یہ جگہ محلہ میاں پورہ سے قریب ہی ہے، جہاں مدرسہ دینیہ کی شوکت منزل والی عمارت واقع ہے[11]

لیکن فکر و فن، علم و کمال اور رنگ و نور کا یہ تاریخی اور عظیم شہر اب تقریباً اجڑ چکا ہے، اس کی رونق ماند پڑ چکی ہے، چہل پہل رخصت ہو چکی ہے، حضرت مولانا ابوالحسن صدیقی غازی پوریؒ کے الفاظ میں:

"اب تو یہ کھنڈرات کا ایک مرقع بن کر رہ گیا ہے، شہر کی آبادی گھٹتے گھٹتے پچاس ہزار کے قریب رہ گئی ہے، مگر نصف صدی پہلے اس میں وہ ساری چہل پہل تھی جو کسی شہر میں پائی جاسکتی تھی، محلے آباد تھے، کاروبار ترقی پر تھا، یہاں کے بسنے والے فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے، دور دراز مقامات سے لوگ تبدیلی آب وہوا کی غرض سے یہاں آیا کرتے تھے، نامور اطباء یہاں مقیم تھے، اچھی

11 ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مشاہیر غازی پور ص ۲۹ تا ۴۰

سوسائٹی تھی، اچھے لوگ تھے، شعر وادب کی مجلسیں گرم رہا کرتی تھیں، اچھے اساتذہ تھے، اچھے علماء تھے، اچھے صوفیاء تھے، گلی کوچے صاف اور سڑکیں ہموار تھیں، رقبہ بھی اس کا بہت بڑا تھا، ۱۸۷۹ء میں بلیلا کو غازی پور سے الگ کر دیا گیا، (تاریخ غازی پور از مسٹر ایچ آر نول) اس کے علاوہ اور بہت سے زرخیز علاقے وقتاً فوقتاً قریبی اضلاع کو منتقل کئے جاتے رہے مثلاً پرگنہ مہائچ بنارس کو[12]

غازی پور کا یادگار سرمایہ - مدرسہ دینیہ

اب اگر غازی پور کے پاس کوئی یادگار سرمایہ بچ گیا ہے تو وہ ہے مدرسہ دینیہ غازی پور اور اس کی سطح سے ہونے والی خدمات، ہم جس دور میں وہاں پہونچے تھے اس وقت نہ صرف غازی پور ضلع میں بلکہ کئی اضلاع میں اس معیار اور شہرت کا کوئی مدرسہ نہ تھا، معیار تعلیم تو درجہ عربی ششم تک ہی تھا، لیکن لائق وفائق اساتذہ، بکثرت ذہین طلبہ کے رجوع اور وہاں کے خاص تعلیمی وتربیتی ماحول نے اس کو ایک آئیڈیل مدرسہ بنادیا تھا، اتناخوبصورت تعلیمی ماحول اور طلبہ میں پڑھنے لکھنے کا ذوق فراواں کم از کم میں نے اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا بلکہ اس کے بعد بھی آج تک کسی تعلیمی ادارہ میں وہ دیکھنے کی حسرت باقی رہی، اساتذہ تو شب زندہ دار ہوتے ہی تھے میں نے رات رات بھر وہاں طلبہ کو بھی کتابوں سے چپکا ہوا دیکھا ہے، جبکہ مدرسہ کے پاس تعلیمی وسائل کی فراوانی نہیں تھی، نہ روشنی کا خاص نظم تھا اور نہ بیٹھنے کے لئے خاطر خواہ فرش میسر تھے، لیکن موم بتی (جو طلبہ اپنے طور پر خریدتے تھے) کی روشنی میں طلبہ اپنی آنکھیں کتابوں میں گاڑے رہتے تھے، نہ ان کو گرمی کی پرواہ تھی اور نہ سخت ٹھنڈی کا احساس، ایک دوسال کے بعد ہمارے دوست مولانا محمد ابوذر کلکتوی قاسمی جو اس وقت وہاں پڑھتے تھے کلکتہ سے مٹی تیل والا دوعدد پیٹرومیکس لے آئے، اس دن ہماری خوشیوں کی انتہا نہ تھی کہ اب ہم کم از کم مغرب سے عشا تک کا تعلیمی سفر پیٹرومیکس کی تیز روشنی میں طے کر سکیں گے، عشا کے بعد کا اللہ مالک ونگہبان ہے۔

---

12 - غازی پور تاریخ کی روشنی میں مؤلفہ مولانا ابوالحسن صدیقیؒ، مشاہیر غازی پور ص ۲۳، ۲۴

ایک یادگار رات

مجھے خوب یاد ہے، مجھے ایک بار قدوری (درجہ عربی سوم میں فقہ کی مشہور نصابی کتاب) پڑھنی تھی، عشا کے بعد روشنی کا انتظام نہیں ہو سکا اور میرا فقر کسی موم بتی یا چراغ کا ممنون کرم نہیں تھا، بقول علامہ اقبالؒ:

ترا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اتفاق سے آسمان پر چودھویں شب کا چاند روشن تھا، فضا بالکل صاف تھی، خدا شاہد ہے میں نے اسی چاند سے روشنی مانگی اور مدرسہ کی چھت پر تنہا بیٹھ کر اسی ٹھنڈی چاندنی میں قدوری کا مطالعہ شروع کیا، اور جب میری شب نے سحر کی تو میری کتاب اختتام پذیر ہو رہی تھی، اذان فجر کے آخری کلمات کے ساتھ میری کتاب کی آخری سطر بھی پوری ہو گئی، اس رات کے لذت مطالعہ کو آج بھی یاد کرتا ہوں تو پورا وجود شرسار ہو جاتا ہے، سوچتا ہوں کاش میری پوری زندگی اسی شب کی اسیر ہو جاتی، وہ شب پھیل جاتی یا زندگی ٹھہر جاتی، پڑھنے کا وہ کیف و سرور مجھے پھر کبھی حاصل نہیں ہوا،..... اور سب سے عجیب بات یہ تھی کہ اس کی خبر تک میں نے اپنے اساتذہ کو نہیں ہونے دی، نہ میں نے مدرسہ کی طرف سے انتظامی کمی کا شکوہ کیا بلکہ حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی،..... ایسے مواقع پر ہم چھپ کر پڑھتے تھے تاکہ اپنا فقر بھی بے آبرو نہ ہو اور مدرسہ کی انتظامی دشواریاں بھی آشکارا نہ ہوں،..... نہ ہمارے لئے کھانے پینے کا کوئی مسئلہ تھا اور نہ رہنے سہنے کا، ہمارے ذہن و دماغ پر صرف ایک ہی خیال سوار رہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟.....

مدرسہ دینیہ کا خوبصورت تعلیمی ماحول

طلبہ میں پڑھنے کی ایسی لگن تھی کہ ان کو اساتذہ کی نگرانی کی بھی حاجت نہ تھی، وہ اپنے ذوق وشوق سے رات رات بھر پڑھتے تھے اور ایک استاذ بھی ان کی نگرانی کے لئے موجود نہیں ہوتا تھا،.....

بعض ساتھی تو اس درجہ مغلوب الحال تھے کہ مدرسہ کی چھت پر جمعہ کی صبح جو پڑھنے بیٹھے تا آنکہ آفتاب نصف النہار تک پہونچ گیا، سخت گرمی کا موسم، تیز چلچلاتی دھوپ میں ان کا پورا بدن شرابور ہو گیا، لیکن اللہ کے بندہ کو کوئی خبر نہیں ہوئی، مدرسہ میں ناشتہ کا وجود نہیں تھا اس لئے دوپہر کے وقت ہی ان کو تنبہ ہوا..... یہ کوئی افسانہ نہیں، زندہ حقیقت ہے اور اس کی گواہی دینے والے لوگ موجود ہیں۔

مجھے آج بھی یاد ہے، میرے وہاں قیام کا غالباً دوسرا یا تیسرا سال ہو گا، مدرسہ وصیۃ العلوم الٰہ آباد سے حضرت مولانا محمد نعمان صاحب معروفیؒ مدرسہ دینیہ غازی پور ملاقات کی غرض سے تشریف لائے، شب انہوں نے حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کے اس کمرہ میں قیام کیا، جو فوقانی منزل پر گنگا کی طرف منہ کئے ہر سرد و گرم کا سامنا کرنے کے لئے تنہا کھڑا تھا، گرمی کا موسم، مولانا کی چارپائی کمرہ کے باہری حصے میں ڈالدی گئی تھی، عشاء کی نماز کے بعد وقفہ بڑھا، شب کا سکوت گہرا ہوتا چلا گیا، گنگا کی موجیں بھی اب محو خواب ہونے لگی تھیں، رات کے دس بجے، گیارہ بجے، بارہ سے کانٹا آگے چلا گیا، مولانا کروٹیں بدل رہے ہیں، گرمی کی چھوٹی رات، مولانا چاہتے تھے کہ کم سے کم ایک بجے تہجد کی نماز سے فارغ ہو جائیں، مگر طلبہ کے قال یقول کی صدائیں تھمنے کا نام نہیں لیتی تھیں، ان کو کیا خبر کہ کسی کو ان کی خاموشی کا انتظار بھی ہے؟.....رات کے دو بج گئے،.....میں گذرتا ہوا مولانا ہی کی طرف چلا گیا،.....مولانا بے چین تھے، میں نے تھوڑی خدمت کی، مولانا نے پوچھا، یہ طلبہ کب سوئیں گے؟ میں نے کہا کہ حضرت ان کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، جب ان کے پڑھنے کا جنون کمزور ہو گا نیند ان کو دبوچ لے گی..... مولانا نے بے ساختہ کہا کہ:

> "پڑھنے کا یہ خوبصورت ماحول اور طلبہ کا یہ ذوق وشوق عہد ماضی کی یاد دلاتا ہے، ہمارے یہاں الٰہ آباد میں یہ ماحول کہاں ہے اور میں نے آج تک کسی جگہ یہ ماحول نہیں دیکھا، مجھے امید ہے کہ یہ بچے آفتاب وماہتاب بن کر چمکیں گے"

مدرسہ دینیہ کے اساتذۂ باکمال

اور ظاہر ہے کہ اس ماحول کو بنانے میں انتظامیہ کے خلوص کے علاوہ ہمارے اساتذہ کا بڑا حصہ

تھا،اس وقت کے اساتذہ میں ناظم تعلیمات حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کے علاوہ حضرت مولانا عبدالرب صاحب جہانا گنجی حال ناظم مدرسہ انوارالعلوم جہانا گنج، حضرت مولانا صفی الرحمن صاحب در بھنگوی حال صدرالمدرسین مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھروارہ در بھنگہ، حضرت مولانا انوار احمد صاحب خیر آبادی صاحب تصانیف کثیرہ حال استاذ حدیث و تفسیر جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ، حضرت مولانا حبیب الرحمن معروفی حال استاذ مدرسہ کوپا گنج، حضرت مولانا رفیع الدین صاحب قاسمی حال مہتمم مدرسہ اسلامیہ دیوگھر اور حضرت مولانا مختار احمد خیر آبادی موجودہ صدرالمدرسین مدرسہ دینیہ غازی پور سب کی محنت و لگن اور آہ سحر گاہی کے نتیجے میں یہ ماحول وجود میں آیا تھا، ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک انجمن تھا، جس کا ظہور وہاں سے نکلنے کے بعد زیادہ ہوا، بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس وقت کے صدر المدرسین حضرت مولانا مشتاق احمد غازی پوریؒ کا ذکر نہ کیا جائے، ظاہر ہے کہ صدرالمدرسین کا کردار سب سے کلیدی ہوتا ہے، وہ مرکز کی عمارت میں رہتے تھے، شوکت منزل کبھی کبھی تشریف لاتے تھے، ان سے مجھے تلمذ کا شرف حاصل نہیں ہوا، لیکن ان کی للّٰہیت و بے نفسی اور مدرسہ کے تعلق سے ان کی فکر مندی بے نظیر تھی، اکثر کسی مہمان زائر کے ساتھ ہی وہ آتے تھے، وہ مدرسہ کی ہر ترقی سے خوش ہوتے تھے اور اونچے الفاظ میں اس کا ذکر کرتے تھے،.....ان کے علاوہ جناب مولانا جلال الدین صاحبؒ اور جناب قاری شبیر احمد صاحب در بھنگوی (حال ناظم مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھروارہ ضلع در بھنگہ) بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں یہ حضرات بھی مرکز کی عمارت میں رہتے تھے، اس لئے ہمارا ان سے کوئی خاص واسطہ نہیں پڑتا تھا، مگر یہ دونوں شخصیتیں بھی گوناگوں کمالات کی مالک تھیں اور مدرسہ میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی تھیں۔

مولانا اعجاز احمد صاحب کی مردم ساز شخصیت

مگر ان سب میں ماحول ساز شخصیت حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی کی تھی، وہ ناظم تعلیمات تھے، تمام اساتذۂ کرام ان کا احترام کرتے، ان کا مشورہ مانتے تھے اور ان کے علمی تفوق کے قائل تھے، وہ انسانوں کے نبض شناش اور ماہر نفسیات تھے، وقت کی نزاکتوں کو خوب سمجھتے تھے، ہر طرح کے علوم

وفنون پر بھی دستگاہ رکھتے تھے، تقریر وتحریر دونوں پر ان کو یکساں قدرت تھی، ان کے مواعظ سیدھے دل میں اترتے محسوس ہوتے تھے، ہر جمعہ کو بعد نماز فجر طلبہ میں وعظ فرماتے، جس میں تعلیم و تعلم، شخصیت سازی، اور علماء وطلبہ کی ذمہ داریاں جیسے حساس موضوعات پر مؤثر گفتگو فرماتے تھے ،بزرگوں کے واقعات توان کے نوک زبان تھے، ہر موقعہ کی رہنمائی کے لئے ان کے پاس حکایات و واقعات کا بڑا ذخیرہ ان کے حافظہ میں موجود تھا، اس پر انداز بیان کی چاشنی سونے پر سہاگہ کا کام کرتی تھی، اسی سے ماحول بنتا تھا،.....اس پر مزید ان کی وجاہت، خداترسی، قوت انجذاب، اور اضطراب وبے قراری مہمیز کا کام کرتی تھیں، وہ خود بھی اپنے خطابات کا بہترین عملی نمونہ تھے، کتابوں اور اصحاب علم سے بڑھ کر ان کا کوئی دوست نہیں تھا، ان کا پورا وقت پڑھنے پڑھانے، مطالعہ وتحقیق، اور تحریر وتصنیف میں گذرتا تھا، اس وقت ان کے عوامی خطابات کا سلسلہ شروع نہ ہوا تھا، جلسوں میں بہت کم شرکت کرتے تھے، بعد میں جب ان کے شاگردوں کا حلقہ وسیع ہوا تو مختلف علاقوں میں شاگردوں سے تعلق اور وہاں کی دینی ضروریات کی بناپر ان کو سفر کرنا پڑا اور پھر اسفار کا مستقل سلسلہ شروع ہوگیا، لیکن ہمارے زمانۂ طالب علمی میں ان کی ساری توجہات کا محور طلبہ ہوتے تھے، اپنی صلاحیتیں طلبہ میں منتقل کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا، اور ان کو اپنے سے بہتر دیکھنا ان کی دلی تمنا ہوتی تھی، ان کے اسی جذب اور کرب کا اثر تھا کہ ان کے بے پناہ علمی اشتغال اور رکھ رکھاؤ اور جاہ وجلال کے باوجود طلبہ ان سے مربوط رہتے تھے، طلبہ کے ہر مسئلہ کے لئے ان کے وقت میں گنجائش ہوتی تھی، وہ ہر طالب علم کے لئے اپنے دل میں درد رکھتے تھے، ہر طالب علم کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھتے تھے، طلبہ کے گھریلو معاملات سے بھی واقفیت رکھتے تھے اور مناسب مشورے دیا کرتے تھے، ان کی خوشی اور غم میں برابر شریک رہتے، حافظہ اتنا غضب کا تھا کہ نہ صرف کتابی عبارتیں بلکہ طلبہ کی صورتیں اور ان سے متعلق باتیں بھی ہر وقت ان کے ذہن میں مستحضر رہتی تھیں، خواہ کتنے ہی عرصہ کے بعد ملاقات ہو فوراً پہچان لیتے تھے، یہ آسان بات نہیں ہے، آدمی برسوں ساتھ رہنے کے بعد بھی لمبے عرصے کے لئے بچھڑ جاتا ہے تو صورتیں ذہن سے محو ہو جاتی ہیں۔

مولانا کی یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی بدولت وہ دلوں پر حکمرانی کرتے تھے، ان کے اشاروں پر طلبہ جان دیتے تھے، جب تک کسی استاذ کو اس درجہ محبوبیت حاصل نہ ہو وہ طلبہ میں انقلابی تعمیر کا کام انجام نہیں دے سکتا، وہ مرد آہن اور مرد انقلاب تھے، جن کے یہاں کوئی گھن گرج نہیں، کوئی شور ہنگامہ، کوئی طوفان نہیں، کوئی نعرۂ انقلاب نہیں، مگر دل ودماغ کی کایا پلٹ جاتی تھی، گرد وپیش میں طلب وجستجو کی ایسی خوشبو پھیل جاتی کہ ہر ایک علم کا دیوانہ ہو جاتا تھا، ایسا ماحول بن جاتا کہ نہ پڑھنے والا بھی پڑھنے پر مجبور ہوتا، نہ چاہنے والے دلوں میں بھی چاہت کی لہریں اٹھنے لگتیں،..... ہر انسان اپنی صلاحیتوں اور اپنے ذوق وشوق سے آگے بڑھتا ہے، علم محنت سے حاصل کیا جاتا ہے، اس کو گھول کر پلایا نہیں جاسکتا، لیکن مولانا کی استاذی کا کمال یہ تھا طالب علم اتنی تیزی سے بدلتا اور ترقی کرتا کہ تھوڑی دیر کے لئے یہ گمان ہوتا کہ شاید علم کا محلول اس کو پلا دیا گیا ہو،..... علم تو عطیۂ الٰہی ہے، وہ مولانا کے اختیار میں نہیں تھا، لیکن وہ علم کا نشہ چڑھانا ضرور جانتے تھے، وہ اپنے زور بیان اور قوت کردار سے طلبہ پر ایسی بے خودی طاری کر دیتے تھے کہ طلبہ اپنی منزل کی طرف بے تکان دوڑ پڑتے تھے، بگڑے سے بگڑے ماحول کو بنانا اور مردہ دلوں میں زندگی کی روح پیدا کر دینا ان کے خم وابرو کا کھیل تھا، وہ مسلمانوں کے اس طبقۂ شباب میں جس سے پوری ملت اسلامیہ کی امیدیں وابستہ ہیں ایسا جوش عمل بھر دیتے تھے کہ ان کی منزل سات ثریا کی بلندی پر بھی ہو تو اس کو پانے کی وہ کوشش کرتے تھے اور اس کے لئے جسم وجان کی ساری راحتیں قربان کرنے اور بڑی سے بڑی مشکلات کا سامنا کرنے کو تیار ہو جاتے تھے، میں نے ڈاکٹر اقبالؔ کا یہ شعر پہلی بار مولانا کے طریقہ کار سے ہی سمجھا:

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

استاذ کامل کی صفات

میں پورے بر صغیر کی بات نہیں کرتا لیکن جہاں تک میرا مشاہدہ و تجربہ ہے، ملک و بیرون ملک کے سفر میں مختلف مدارس و شخصیات کی زیارت کا موقعہ ملا ہے، اس کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں، استاذ کامل کی جو صفات مولانا کی شخصیت میں دیکھیں وہ کہیں نظر نہ آئیں، معاملہ قابلیت وصلاحیت کا نہیں اور نہ شب بیداری وزہد و تقویٰ کا، نہ شاہکار تحریروں اور دھواں دھار تقریروں کا، استاذی اور مردم سازی کا ہے۔

ایک استاذ کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ اپنا فن اپنے شاگردوں میں اپنے سے بہتر طور پر منتقل کر دے، یعنی علم و کمال کو نقطۂ جامد کی طرح نہیں بلکہ شعلۂ جوالہ کی صورت میں منتقل کرے، جس کی بلندیٔ پرواز صرف اس کی عظمت کی دلیل نہ ہو بلکہ ایک پوری نسل اور جماعت اس پرواز میں شریک ہو،..... جس کی نگاہ طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ان کے اخلاقی اقدار پر بھی ہو،..... ان کے خاندانی پس منظر اور اقتصادی حالات سے بھی واقف ہو،..... تعلیم وتربیت کے لئے خون جگر صرف کرنے کا جذبہ بھی رکھتا ہو اور سلیقہ بھی،..... طلبہ کے ساتھ انفرادی طور پر فکر مندی بھی ہو اور دردمندی بھی، ساز دل بھی رکھتا ہو اور سوز جگر بھی،..... ذاتی زندگی بھی اس کی مثالی ہو اور اجتماعی زندگی بھی، اس کی زندگی نور ایمانی اور خوف خدا کی آئینہ دار ہو،..... اس کا طرز عمل پیغام عمل دینے والا ہو، وقتی ہیجان پیدا کرنے والا نہیں،..... اس کو دیکھنے سے زندگی کا حوصلہ ملتا ہو مایوسی نہیں، جس کے شاگرد اس کے اشاروں پر ہفت خواں طے کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں، جو گر کر بھی اٹھ جانے کی ہمت رکھتے ہوں، بقول شاعر:

اس طرح طے کی ہیں ہم نے منزلیں
گر پڑے ،گر کر اٹھے ،اٹھ کر چلے

کسی شخص میں ان میں سے کوئی ایک بات بھی پیدا ہو جائے ،تو اس کی استاذی کے لئے کافی

ہے، لیکن اگر یہ تمام باتیں کسی ایک فرد میں جمع ہو جائیں تو وہ استاذ کامل بن جاتا ہے اور وہ فرد نہیں، انجمن ہو جاتا ہے، اور اس کا لمحہ لمحہ ایک ایک صدی کے برابر ہوتا ہے،.....ہمارے مولانا اعجاز صاحب بھی انہی خوش نصیب افراد میں تھے، جن کو قدرت کی طرف سے استاذی کے یہ تمام کمالات ودیعت کر دیئے گئے تھے، اسی لئے ان کی شخصیت ایک جماعت اور ان کی حیات ایک عہد کے برابر تھی:

بہت لگتا تھا جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے

دوسری جانب شاگردوں اور اصحاب تلمذ کی طرف سے جو محبت و گرویدگی ان کو ملی اور ان کے شاگردوں نے ان کے نظریۂ تعلیم و تربیت کے تعلق سے جس عملی صداقت کا مظاہرہ کیا کہ شاید ایسے خوش نصیبوں کو آج ہندوستان میں انگلیوں پر گنا جاسکے، عہد قدیم میں اس کی مثالیں بہت ملتی ہیں، مولانا اِس دور میں اُسی قافلۂ قدس کے بچھڑے ہوئے شہسوار تھے جو آخر اپنے کارواں سے جاملا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مدرسہ دینیہ میری نگاہ میں

میرا علم اور میری صلاحیت کیا، مولانا کے بلند پرواز شاگردوں میں میری حیثیت ہی کیا، لیکن بطور اعتراف اور جذبۂ تشکر کے کہتا ہوں کہ مطالعہ و تحقیق اور تحریر و تقریر کا جو بھی ٹوٹا پھوٹا سلیقہ مجھے حاصل ہوا اس میں مدرسہ دینیہ کے اس چار سالہ قیام کا بنیادی حصہ ہے، بعد کے تمام ادوار تکمیلات و تحسینات کے ہیں، بنیادیں اسی شوکت منزل کی چہار دیواریوں میں قائم ہوئیں جو آج بھی میرے خوابوں اور خیالوں کی منزل اور میری تمناؤں اور آرزوؤں کا مسکن ہے، میری زندگی کے قیمتی ماہ وسال وہاں گذرے ہیں، وہاں میرا بچپن عہد شباب سے ہم آغوش ہوا ہے، اسی آب وہوا نے مجھے قوت پرواز بخشی، اسی دریا کی موجوں نے مجھے تیرنا سکھایا، خود کلامی اور خدا کلامی میں نے وہیں کے ذرات سے سیکھی، وہیں کے بام ودر اور شام وسحر میرے چوبیس گھنٹوں کے رفیق رہے، جو میرے غمگسار بھی تھے اور شریک درد

بھی، مجھے جو بھی دیا اسی ماحول نے دیا.....

میں نے مدرسہ دینیہ کا وہ دور عروج پایا ہے، جس کو تاریخی تسلسل نہیں تاریخی ارتعاش کہنا زیادہ بجا ہوگا، جس کی تعمیر ایک مرد درویش کی نگاہ مؤمنانہ اور ایک مرد غیور کے عزم قلندرانہ کا نتیجہ تھی، جو وہاں کے باغباں کے خوابوں کی تعبیر تھی، جس میں اس کا اور اس کے رفقاء کار کا خون جگر پیوست ہوا تھا، میں مدرسہ دینیہ کے اس نقطۂ ارتقاء کا ساتھی ہوں جہاں ایک جنبش قدم صدیوں کے سفر کے لئے کافی ہوتی تھی، جس کے لمحوں میں وہ برکت تھی جو آج برسوں کو حاصل نہیں ہے، جہاں مسافروں کی نقل وحرکت کے آگے ماہ وسال کی گردشیں تھم جاتی تھیں، یہ مدرسہ دینیہ کا وہ عہد زریں تھا جب نہ ساقی کو کوئی بخل تھا اور نہ رند میں تکان، نہ جام وجم کی گردشیں رکتی تھیں اور نہ میخواروں کا جمگھٹا کم ہوتا تھا، جب میخانہ لبریز تھا، بادہ خواروں کی بھیڑ تھی، جب طلبہ میں یہ جذبہ موجزن ہوا کرتا تھا:

ہمیں گھر سے کیا مطلب، مدرسہ ہے وطن اپنا
مریں گے ہم کتابوں میں، ورق ہوگا کفن اپنا

میخانہ آج بھی اسی طرح قائم ہے، مگر وہ بادہ خوار نہیں، ساقی ایک ایک کرکے رخصت ہوتے جارہے ہیں، جیسے موتی کا پرویا ہوا ہار ٹوٹ گیا ہو، اب نہ وہ اہل ہنر ہیں نہ وہ اہل طلب.....

مولاناؒ کی زندگی کا عہد زریں

مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ اسی سلسلۂ زریں کی شاندار کڑی تھے، مولانا کی زندگی کا بھی یہ عہد زریں تھا، ان کی مردم ساز شخصیت کے جو کمالات اس دور میں ظاہر ہوئے وہ پھر دیکھنے میں نہیں آئے، یہاں مولانا نے جو افراد تیار کئے وہ ان کی پوری زندگی کا حاصل ہیں، یہاں سے نکلنے کے بعد مولانا کی شخصیت میں وسعت پیدا ہوئی، عوامی خدمات کا دائرہ بڑھا، درسیات کی اونچی کتابیں پڑھانے کو ملیں، ایک محقق ومصنف کی حیثیت سے ان کا تعارف عام ہوا، ان کی چھپنے والی تحریروں پر بڑے بڑے ادیبوں نے سر دھنے، شاندار تبصرے لکھے، ان کی کتابوں نے اہل علم وتحقیق سے قیمتی خراج تحسین

وصول کئے، شخصیت کے وقار میں اضافہ ہوا اور ان کی عظمت میں چار چاند لگے،..... لیکن پھر.....
مصروفیات اتنی بڑھیں کہ افراد سازی کا وہ سلسلۂ زریں آہستہ پڑ گیا جو ان کا خاص امتیاز تھا اور جس کی وجہ سے وہ جہاں بھی جاتے ان کے گرد طلبہ کا ہجوم ہو جاتا تھا، طلبگاروں کو ان کے اندر اسی استاذ کی تلاش تھی جو غازی پور میں نظر آئے تھے،..... ارباب جستجو ان کی اسی شخصیت کی کھوج میں رہے، جو غازی پور کے افق پر چمکتی ہوئی دکھائی دی تھی،..... بادہ خوار اپنے اسی ساقی کی طلب میں بھٹکتے رہے جو رسم میکشی سے بالاتر ہو کر دل و نگاہ کو مخمور کرنے کا فن جانتا تھا،..... لیکن مولانا کا دائرۂ عمل اتنا وسیع ہو گیا تھا، ان کے کاندھوں پر اتنی ذمہ داریاں آگئی تھیں اور وہ آفاق کی ان وسعتوں میں جا پہونچے تھے جہاں ہر طلبگار کی رسائی ممکن نہ تھی،..... اب ان سے فیض وہی لوگ پاسکتے تھے جو اس ظرف کے حامل ہوں اور اتنی قوت پرواز رکھتے ہوں۔

مولانا کا طریقۂ تعلیم و تربیت

یوں تو میں مولانا کے گوناگوں کمالات کا ہر طرح مداح اور معتقد ہوں لیکن ان کے جس وصف نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ تھا ان کا یہی طریقۂ تربیت اور مردم سازی کی صلاحیت،..... میرے نزدیک یہ وصف بیش بہا آج دنیا سے عنقا ہوتا جارہا ہے، اس وصف میں مولانا کو جو کمال و اختصاص حاصل تھا وہ سراسر انعام الٰہی تھا، وہ نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو کے قائل تھے، افہام و تفہیم بھی جانتے تھے اور تنبیہ و سرزنش بھی۔

☆ ایک بار ایک طالب علم کو اتنا مارا کہ اس کے سر سے خون بہنے لگا، یہ دیکھ کر مولانا خود بھی روئے وہ طالب علم بھی رویا اور سارا مدرسہ رویا، رونے رلانے کا یہ دورانیہ قریب ایک گھنٹہ کا رہا، آج بھی اس منظر کو سوچتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص کے جذبۂ انفعال نے سارے ماحول کو سوگوار کر دیا..... مولانا کا یہی امتیاز تھا، انتہائی جذبات میں بھی وہ خوف خدا سے غافل نہیں ہوتے تھے،..... بہادر شاہ ظفرؔ کے اس شعر کے مصداق:

ظفرؔ اس کو نہ آدمی جانئے گا، چاہے وہ ہو کتنا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے طیش میں خوف خدا نہ رہے، جسے عیش میں یاد خدا نہ رہے

میرے قطبی پڑھنے کا قصہ

یہ تو تربیت کا نمونہ تھا اب طریقۂ تعلیم کی ایک مثال دیکھئے، میں درجہ عربی چہارم کا طالب علم تھا، منطق کی مشہور کتاب قطبی داخل درس تھی، جو مولانا سے متعلق تھی، کچھ اسباق پڑھانے کے بعد ان کو احساس ہوا کہ یا تو اس کتاب سے طلبہ کی دلچسپی کم ہے یا یہ ان کی ذہنی سطح سے بالاتر ہے، مولانا نے کہا اس طرح پڑھانے سے کیا فائدہ؟ انہوں نے اسباق بند کر دیئے،..... مجھے بڑا احساس ہوا کہ ایک اہم معقولی کتاب کے درس سے میں محروم ہو گیا، ابتدا میں مجھے منطق سے یوں بھی دلچسپی بہت زیادہ تھی، میرا خیال تھا کہ یہ فن صرف ذہین ترین لوگوں کا ہے اور جو منطق کی کتابیں نہیں پڑھے گا اس کی ذکاوت میں اضافہ نہیں ہو گا،..... میں نے اپنے جد اکبر حضرت مولانا عبد الشکور آہ مظفر پوریؒ کے بارے میں اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ کئی سال تک انہوں نے منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھیں، جس کی وجہ سے ان میں وہ خود اعتمادی پیدا ہوئی کہ دار العلوم دیوبند کے داخلہ امتحان میں اپنے ممتحنین کے سامنے ذرا مرعوب نہ ہوئے، بلکہ اپنی حاضر جوابی اور ذہانت و ذکاوت سے ممتحنین کو متأثر کر دیا،..... میں نے سوچا یہ تو میرا خاندانی فن ہے اس سے دستبردار ہونا مناسب نہیں، میں نے مولانا سے دوبارہ اسباق شروع کرانے کی درخواست کی، لیکن مولانا نے توجہ نہ دی، جب میں نے اصرار کیا تو انہوں نے کہا کہ اب تو سبق بند کر چکا ہوں اس لئے دوبارہ شروع نہیں کر سکتا، البتہ اگر تم پڑھنا چاہتے ہو تو عشا کی اذان سے آدھ گھنٹہ قبل وقت دے سکتا ہوں، البتہ یہ میرے لکھنے پڑھنے کا وقت ہے، اس لئے میں باقاعدہ پڑھاؤں گا نہیں، بلکہ تم مطالعہ کر کے آؤ اور اپنا حاصل مطالعہ سناؤ، میں اس کی تصحیح و تصویب کر سکتا ہوں اور کہیں دقت ہو گی تو سمجھا بھی دوں گا،..... چنانچہ اسی طرح ہوا، تصورات کا پورا حصہ میں نے پندرہ (۱۵) دنوں میں پڑھ لیا جس میں مولانا کو بہت کم بولنے اور سمجھانے کی نوبت آئی، جب تصدیقات شروع ہوئی تو مولانا نے یہ کہہ

کر سبق بند کر دیا کہ اب پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے خود ہی مطالعہ کر ڈالو،.....اللہ کی قدرت، جب میں دارالعلوم دیوبند میں معین مدرس ہوا اور مجھ سے قطبی کے اسباق متعلق ہوئے تو وہاں تصدیقات ہی کا حصہ داخل نصاب تھا، جو اس حقیر طالب علم نے خود مطالعہ کر کے پڑھاڈالا اور مولانا کے یہ الفاظ میرے سامعہ سے روز ٹکراتے رہے کہ "تمہیں پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے خود مطالعہ کر ڈالو.....اللہ پاک نے مولانا کے ان لفظوں کی لاج رکھ لی۔

ع وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

علوم قاسمی کی طرف توجہ

☆ ایک بار نہ معلوم کیسے میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ مسلمان اپنے آپ کو خدا پرست کہتے ہیں جبکہ ان کا رخ بھی اپنی نمازوں میں خانہ کعبہ کی طرف ہوتا ہے اور کعبہ پتھر کے بنے اس گھر کا نام ہے جسے اسی دنیا کے انسانوں نے بنایا ہے، اگر نماز میں قبلہ درست نہ ہو تو نماز نہیں ہوتی، حالانکہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خدا زمان و مکان کی قید سے ماوراء ہے، قرآن کہتا ہے اینما تولوا فثم وجہ اللہ (جدھر بھی رخ کرو اللہ اللہ ہی ہے) پھر نماز میں قبلہ کی قید کیوں ہے؟ کہیں یہ بت پرستی کی مشابہت تو نہیں؟ (معاذ اللہ)

اس زمانے میں اس طرح کے اوٹ پٹانگ سوالات میرے ذہن میں بکثرت پیدا ہوتے تھے ،جو مطالعہ سے نہیں بلکہ سوچ سے پیدا ہوتے تھے،.....میں نے ایک دن درس کے ختم پر مولانا کے سامنے یہ سوال رکھا،.....مولانا نے میرا سوال بڑی توجہ کے ساتھ سنا اور اس کا جواب دینے کے بجائے الماری میں رکھی ایک کتاب میری طرف بڑھائی اور کہا تمہارے سوال کا جواب اس کتاب میں ہے،.....وہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی کتاب " قبلہ نما" تھی،.....ارشاد ہوا کہ اس کتاب کو غور سے پڑھو اور جو سمجھ میں آئے وہ مجھے بھی آکر بتاؤ،.....

اس طرح مولانا کی عنایت سے پہلی بار مجھے علوم قاسمی کی طرف توجہ ہوئی، میں نے عربی چہارم ہی کے سال حضرت نانوتویؒ کی یکے بعد دیگرے مدرسہ کی لائبریری میں موجود تمام کتابیں پڑھ

ڈالیں، جو رہ گئیں ان کے پڑھنے کا شوق دل میں موجزن رہا، میری دلی خواہش تھی کہ دیوبند جانے سے پہلے بانی دیوبند سے علمی مناسبت پیدا کرلی جائے،..... دیوبند داخلہ کے بعد سب سے پہلے میں نے حضرت نانوتویؒ کی بقیہ کتابیں تلاش کیں، اسی ضمن میں حضرت کی فارسی کتاب "مصابیح التراویح" کا میں نے اردو ترجمہ کرڈالا۔

حضرت نانوتویؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "آب حیات" دیوبند کی مارکیٹ میں دستیاب نہیں تھی میں نے ایک صاحب کے ذریعہ پاکستان سے منگوائی، مولانا کو میری اس دلچسپی کا علم ہوا تو بلا طلب ازراہ عنایت کچھ پیسے بھی بھیج دیئے اور لکھا یہ تمہارے لئے ہدیہ ہے، آب حیات کو سمجھنے میں بڑی دقت پیش آئی میں نے مولانا سے عرض کیا تو مولانا نے لکھا رمضان کی چھٹی میں بھیرہ (مولانا کا آبائی گاؤں) چلے آؤ، میں نے بھی وہ کتاب صرف آدھی پڑھی ہے، آدھی کے بعد سر چکرانے لگا تو چھوڑ دیا تھا، آجاؤ اس بہانے ہم بھی وہ کتاب پڑھ لیں گے،..... لیکن ایک گھریلو ضرورت پیش آجانے کی وجہ سے رمضان میں وقت نہ نکال سکا۔

☆اسی زمانہ میں میں نے حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری کی کتاب "البراہین القاطعہ" پڑھی اور امکان کذب باری کے مسئلہ پر مجھے بہت سی تشویشات پیش آئیں، اسی سلسلے میں وہ علمی مراسلت ہوئی جس کا ایک حصہ مولانا نے "حدیث دوستاں" میں محفوظ کردیا ہے۔

☆اسی دور میں دیہات میں نماز جمعہ کے مسئلہ پر حضرت نانوتویؒ کے ایک فارسی مکتوب کا میں نے ترجمہ کیا، جس میں حضرتؒ نے دلائل کے ساتھ جمعہ کے بارے میں حنفیہ کے موقف کو واضح کیا ہے اور بحالات موجودہ دیہاتوں میں جمعہ کے جواز بلکہ وجوب کا رجحان پیش فرمایا ہے۔

☆حضرت نانوتویؒ کی زیادہ تر کتابیں مجھے کتب خانہ رحیمیہ دیوبند سے دستیاب ہوئیں، ہمارے قیام دیوبند کے زمانے میں وہاں کے مالک غالباً مولانا اسحاق صاحب تھے، بڑے باذوق صاحب علم تھے، اگر چیکہ ان کا کتب خانہ اب تاریخ کا حصہ بنتا جارہا تھا اور دوسرے پروفیشنل کتب خانے مارکیٹ پر چھارہے تھے، لیکن نادر مطبوعات کا بیشتر ذخیرہ وہیں ملتا تھا، ہر سال دارالعلوم میں امتیازی نمبرات حاصل

کرنے والے طلبہ کو بھی وہ اپنی طرف سے انعامات دیتے تھے، مجھے مولانا اسحاق اور ان کے کتب خانہ سے بڑی مناسبت تھی، میں اکثر عصر کے بعد ان کے یہاں چلا جاتا، اور کتابوں اور اوراق بوسیدہ کے انبار میں اس طرح کی چیزیں تلاش کرتا رہتا تھا۔

☆ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بار مولانا دیوبند تشریف لائے، علوم قاسمیہ سے میری مناسبت اور میری بعض تحریروں کو دیکھ کر انہوں نے رسالہ دارالعلوم دیوبند میں ان کی اشاعت کی ترغیب دی اور خود مدیر رسالہ حضرت مولانا حبیب الرحمن قاسمیؒ سے اپنے قدیم تعلق کی بنا پر میرے مضامین شائع کرنے کی سفارش بھی فرمائی، چنانچہ اس کے بعد عرصہ تک رسالہ دارالعلوم میں میرے مضامین کا سلسلہ "معارف قاسمیہ" کے نام سے جاری رہا، مضامین چھپتے رہے اور میں خوش ہوتا رہا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب پودا انہی کی لگائی ہوئی تھی،

بہار اب جو گلشن میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی ہے

میرا شوق مطالعہ

☆ میرا شوق مطالعہ بھی مولانا ہی کی دین ہے، غازی پور میں میرے قیام کا دوسرا سال تھا، میں عربی سوم میں آچکا تھا لیکن سوائے اپنے پڑھے ہوئے اسباق کے اگلے اسباق یا خارجی مطالعہ کی توفیق نہیں ہوتی تھی، اسی طرح میں عشاء کی نماز کے بعد پڑھنے اور جاگنے کا قائل نہیں تھا، میں مدرسہ کے ذہین ترین لڑکوں میں شمار کیا جاتا تھا، اس لئے مغرب کے بعد ساتھیوں کو پڑھے ہوئے اسباق کی تکرار میں ہی کراتا تھا، عشا تک ساری کتابوں کے تکرار سے فارغ ہو جاتا تھا اور میرا اپنا حال یہ تھا کہ بوقت درس ہی سارے اسباق یاد ہو جاتے تھے، اس لئے بھی عشا کے بعد جاگنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی، مدرسہ کے تمام طلبہ پابندی کے ساتھ عشاء کے بعد پڑھتے تھے، لیکن میں فوراً بستر پر دراز ہو جاتا اور طلبہ کے ہنگاموں میں بھی مجھے نیند آجاتی تھی،.....

ایک دن کافیہ کے درس میں مولانا سے میں نے ایک سوال کیا، اس کا جواب حاشیہ میں موجود تھا، مولانا نے کہا تمہارا کا جواب حاشیہ میں موجود ہے، حاشیہ فارسی میں تھا، سمجھ میں نہیں آیا، مولانا نے کہا جاؤ کل اس کو سمجھ کر آنا، میرے ذہن پر مولانا کا رعب اتنا تھا کہ ان کا کوئی حکم میرے لئے ٹالنا آسان نہیں تھا، میں نے مغرب کے بعد تکرار سے بچے ہوئے وقت کو اس کے لئے استعمال کیا لیکن وہ ناکافی ثابت ہوا، بالآخر زندگی میں پہلی بار عشا کے بعد کتاب لیکر بیٹھنے کی خفت گوارا کی اور قریب ڈیڑھ گھنٹہ کی دماغ سوزی کے بعد چار سطری حاشیہ کسی حد تک سمجھ میں آیا،.....اس دن سے عشا کے بعد اگلے سبق کی تیاری کا معمول بن گیا، پھر شاید ہی کبھی ایسا ہوا کہ اگلا سبق سمجھنے کے لئے مجھے استاذ کی تقریر کی ضرورت رہی ہو، بنیادی مضامین میرے ذہن میں ہوتے تھے، استاذ سے ان کی تعبیرات و تشریحات حاصل کرتا تھا، نیز اپنے فہم کی توثیق بھی ہوتی تھی،..... پھر تو مجھے ایسی مشاقی ہوگئی کہ عبارت کی خواندگی سے ہی استاذ کو اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ طالب علم عبارت سمجھ کر پڑھ رہا ہے۔

☆اس ضمن میں عربی پنجم کے سال کا ایک واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن فتحپوری دامت برکاتہم مولانا کے دوستوں میں ہیں، اس زمانہ میں وہ مدرسہ امدادیہ ممبئی کے مفتی تھے اور اب مہاراشٹر کے مفتی اعظم ہیں، وہ کافی علیل ہو کر غالباً تبدیلیٔ آب وہوا کی غرض سے ایک ماہ سے بھی زیادہ شوکت منزل کی پر فضا عمارت میں قیام کیا، رات میں ان کا قیام بالائی منزل پر مولانا کے حجرۂ خاص میں تھا، ایک دن ہم لوگ ہدایہ کے سبق کے لئے حاضر ہوئے تو مولانا کی طبیعت مضمحل تھی، مولانا لیٹے ہوئے تھے، مفتی صاحب سے کہا: آپ پڑھا دیں، مفتی صاحب راضی ہوگئے، میں نے عبارت پڑھی، درس کے اختتام پر مفتی صاحب نے میرا تعارف پوچھا اور کہا کہ تمہاری عبارت خوانی سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا تم یہ سبق پہلے ہی سے سمجھے ہوئے ہو، اور پھر بطور انعام اپنی جیب سے پانچ روپئے نکال کر دیئے۔

میری قلمی زندگی کا آغاز

یہ قلم جو آج چل رہا ہے یہ بھی ہاتھ میں انہی کا پکڑایا ہوا ہے، طلبہ کی تحریر و تقریر کی مشق کے

لئے مدرسہ دینیہ میں تہذیب البیان کے نام سے انجمن قائم تھی، ہر جمعرات کو اس کے ماتحت مغرب کے بعد پروگرام ہوتے تھے، طلبہ کے دو گروپ تھے، دونوں کے ذمہ دار ان طلبہ میں سے منتخب کئے جاتے تھے، مولانا انجمن کے نگران اعلی تھے، ذمہ دار طالب علم کو "معلن" کہا جاتا تھا، اور یہ ساری ذمہ داریاں خود مولانا کی نگرانی میں تقسیم کی جاتی تھیں، میں عربی سوم میں تھا، طلبہ کے ایک گروپ کا "معلن" حافظ عبداللہ صاحب کو بنایا گیا جو عربی پنجم کے طالب علم تھے اور ان کا نائب مولانا نے مجھے نامزد فرمایا،.....، ساتھ ہی مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ ہر ہفتہ طلبہ کی ترغیب و تحریص کے لئے تحریر و تقریر کی افادیت پر جو چند سطری اعلان نکلتا ہے، وہ لکھنا بھی تمہاری ذمہ داری ہوگی..... میں کانپ کر رہ گیا ایک تو میری عمر بہت کم تھی، بمشکل بارہ یا تیرہ سال، دوسرے میری طبیعت کم آمیزی کی طرف مائل تھی،..... مگر مولانا کے حکم کے سامنے کون پر مار سکتا تھا... اس طرح بالجبر میرے ہاتھ میں قلم پکڑایا گیا۔

یہ سال میرے لئے بڑی آزمائشوں کا رہا، ایک ہی موضوع پر ہر ہفتہ نئی تعبیرات و عنوانات کے ساتھ مضمون تیار کرنا آسان بات نہ تھی اور سب سے مشکل مرحلہ اس کو مولانا کی نگاہ سے گذارنے کا تھا، مولانا کی تصحیح و منظوری کے بغیر کوئی مضمون آویزاں نہیں کیا جاسکتا تھا اور اس پر تاکید یہ کہ اتوار تک اعلان آویزاں ہو جانا چاہئے، تاکہ طلبہ کو تیاریوں کا موقعہ مل سکے، میں ہی جانتا ہوں کہ ہر ہفتہ اس مضمون کو تیار کرنے میں کتنے ہفت خواں مجھے طے کرنے پڑتے تھے..... اور وہ گھڑی شاید میرے لئے قیامت کی ہوتی تھی، جب ٹوٹی پھوٹی بچکانہ تحریر کو لیکر میرے قدم مولانا کے حجرہ کی طرف بڑھتے تھے، اگر وہ مضمون کاٹ چھانٹ کے بعد بھی پاس ہو جاتا تو میں اپنے لئے نئی زندگی محسوس کرتا تھا..... نہ معلوم مجھے اس کے لئے کتنی ریاضتیں اور کتنی کتابوں کی ورق گردانیاں کرنی پڑیں، کس کس وادی کی خاک چھاننی پڑی، لیکن کبھی ہمت نہیں ہاری اور نہ اپنی پونجی کے بارے کوئی خوش فہمی پیدا ہوئی، ہمیشہ اپنا سکہ کھوٹا محسوس ہوا۔

آزمائشوں بھرا یہ سال میری قلمی زندگی میں شاہ کلید کی حیثیت رکھتا ہے، لمحہ لمحہ کرب میں مجھے علم و ادب کی کیسی کیسی فتوحات حاصل ہوئیں، فکر و نظر کے کتنے دریچے وا ہوئے، ذہن و تخیل کو کیا

کیا بلند پروازیاں نصیب ہوئیں؟ ہاتھ میں دیئے گئے قلم پر میری گرفت کیسی مضبوط ہوئی؟ اور ایک مفلس بے نوا کو لوح و قلم کی کتنی مملکتیں عطا کی گئیں؟..... میرے پاس جذبۂ تشکر اور احساس ممنونیت کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں ہیں..... اس میں رب العالمین کے فضل و کرم کے ساتھ میر کارواں کی نظر کرم بھی شامل رہی، اللہ پاک ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، ہم جیسے کتنے ہی مس خام کو کندن اور ناکندہ تراشوں کو پیکر حسن و معنیٰ بنادیا:

ننگ میخانہ تھا میں ساقی نے یہ کیا کردیا
پینے والے کہہ اٹھے یا پیر میخانہ مجھے

مولانا کی وسیع النظری

مولانا کا ایک بڑا امتیاز ان کی وسیع النظری ہے، ان میں علاقائی عصبیت بالکل نہ تھی، ان کے روابط ہر علاقہ کے لوگوں سے تھے، ہندوستان میں مشرق و مغرب اور شمال و جنوب ان کے لئے برابر تھے، خاص طور پر اہل بہار سے ان کو بڑا تعلق تھا، ان کا اصل حلقۂ علمی بھی یہی تھا، جن ممتاز اصحاب علم و رشد سے ان کو گہری وابستگی تھی ان میں بھی اکثریت اہل بہار کی تھی، بہار کے لوگوں نے بھی ان کی جو قدر و منزلت پہچانی شاید اتنی بڑی سطح پر کسی اور علاقہ کو یہ خصوصیت حاصل نہ ہوئی،.....

بہار پھر اپنی پہلی تاریخ کی طرف واپس آئے

بہار کے موجودہ علمی زوال، دینی کمزوری اور جہل و ظلمت کے عموم و شیوع پر وہ بہت رنجیدہ تھے، ان کی خواہش تھی کہ بہار پھر اپنی پہلی تاریخ پر واپس آجائے، اس گلشن میں پھر وہی بادنو بہار چلے جو صدیوں قبل اس سرزمین کی پہچان تھی، جہاں ہر رنگ و نور کے پھول کھلتے تھے، ہر طرف قمریوں اور بلبلوں کی صدائے دلنواز گونجتی تھی، ہر علم و فن کا درس یہاں ہوتا تھا، ملک و بیرون ملک کے تشنگان علم یہاں آتے تھے اور اسلامی ہندوستان کو جب کبھی کوئی علمی مشکل درپیش ہوتی تو علماء بہار اس کو حل کرنے کے لئے آگے بڑھتے تھے۔

قدیم ہندوستان کی علمی تاریخ میں بہار ایک مرکز علم کی حیثیت سے معروف تھا اور پورے ہندوستان کے لئے سرمایۂ افتخار تھا، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامیؒ کی "مآثر الکرام" اور حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کی "اخبار الاخیار" کے حوالوں سے لکھا ہے کہ:

"حضرت شاہ ولی اللہؒ کے دودمان عالی کے مشہور بزرگ شیخ عبد العزیز شکر بارؒ کے دادا شیخ طاہرؒ نے تحصیل علم کے لئے ملتان سے بہار کا سفر کیا اور شیخ بدھ (یا بودھن) حقانیؒ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا[13]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں بہار علم کا بڑا مرکز تھا، اور دور دراز سے لوگ تحصیل علم کے لئے یہاں آتے تھے، اور خاص بات یہ تھی کہ ابتدا سے لیکر انتہائی درجات تک کی مکمل تعلیم کا یہاں معقول انتظام تھا، اسی لئے یہاں کے طلبہ کو تحصیل علم کے لئے بہار سے باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، ملا موہن بہاریؒ جو بعد میں شہزادہ اورنگ زیبؒ کے استاذ ہوئے آزاد بلگرامیؒ کے بقول ان کی اول سے آخر تک تعلیم بہار ہی میں ہوئی، اور یہاں ان کے علم کی شہرت ہی سے متاثر ہو کر بادشاہ شاہجہاں کی توجہ ان کی جانب ہوئی[14]

ملا احمد سعیدؒ مفتی عساکر شاہجہانی کے بارے میں معروف ہے کہ وہ بہار کے تھے اور ان کی پوری تعلیم بہار ہی میں ہوئی تھی اپنے والد ملا سعدؒ سے تعلیم حاصل کی، (بادشاہ نامہ ج ۲) بہار کی اس علمی خود مختاری کا اعتراف حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلویؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی کیا ہے، لکھا ہے کہ:

بہار مجمع علماء بود[15] ترجمہ: بہار سربرآوردہ علماء کا مرکز تھا۔

علامہ مناظر احسن گیلانیؒ علامہ شوق نیمویؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

13 - اخبار الاخیار ص ۱۹۵، مآثر الکرام ص ۴۳

14 - دیکھئے مآثر الکرام ص ۴۳

15 - نظام تعلیم و تربیت ص ۴۸

"آپ کا اسم گرامی مولانا ظہیر احسن اور تخلص شوقؔ تھا، حدیث خصوصاً نقد رجال میں ان کا جو پایہ تھا اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ ان کی دقت نظر کے مداحوں میں تھے، آپ "نیمی" بہار میں پیدا ہوئے، اور مولانا عبد الحی فرنگی محلیؒ سے درس نظامیہ کی تکمیل کر کے پٹنہ میں مطب کے ساتھ ساتھ تالیف و تصنیف کا کاروبار شروع کیا، آثار السنن کے چند ابتدائی حصے ملک میں شائع ہوئے کہ سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی، لیکن افسوس عمر کم پائی، کتاب ناتمام رہی، پھر بھی جتنا حصہ شائع ہو چکا ہے، حنفی مدارس میں بعضوں نے اس کو نصاب کا جزو قرار دیا ہے، یہ کتاب حنفی مکتب خیال کی تائید میں محدثانہ اصول پر مرتب کی گئی ہے، علامہ تھانویؒ نے اس کا تکملہ بھی کرایا ہے، مولانا شوقؔ اردو زبان کے بڑے نامور شعراء میں تھے، جلال لکھنویؒ سے زبان کے مسئلے میں تحریری مناظرہ بھی کیا تھا، جس میں مولانا ہی کی جیت ہوئی تھی، ایک بڑی دردناک مثنوی اردو میں لکھی ہے، اور بھی بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں[16]

خود میں نے حضرت مولانا عبد الرحمن دربھنگویؒ امیر شریعت خامس بہار واڑیسہ کو دیکھا ہے، علم و فضل میں یکتائے روزگار اور وسعت مطالعہ و استحضار علمی میں بے نظیر تھے، ان کی پوری تعلیم اسی بہار میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں ہوئی، جب حضرت مولانا عبد الشکور آہؔ مظفر پوریؒ (حقیر کے جد اکبر) جیسے عباقرۂ روزگار وہاں تدریسی خدمات انجام دیتے تھے، مولانا ان کے خادم خاص تھے اور سفر و حضر میں ساتھ رہتے تھے، ان کی علمی گفتگو سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ مولانا نے دیوبند کا منہ نہیں دیکھا ہے۔

تاریخ کا یہ تسلسل بعد کے ادوار میں بھی جاری رہا لیکن ہندوستان سے اسلامی حکومت کے سقوط کے بعد بہار کی مرکزیت بھی جاتی رہی، افراد پیدا ہوتے رہے، لیکن خود بہار کو براہ راست کم ہی

---

16 - ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، حاشیہ ص ۳۵۳

لوگوں سے فائدہ ملا، زیادہ تر لوگوں نے باہر کی دنیا کو اپنا میدان عمل بنایا اور ان کے ذریعہ جو بھی علمی مراکز قائم ہوئے وہ اسی علاقہ کی طرف منسوب ہوئے۔

مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ گو بہار کے نہیں تھی مگر اس معاملے میں ان کی حساسیت علماء بہار سے کم نہیں تھی، وہ چاہتے تھے کہ بہار کے فضلاء خود بہار کو مرکز عمل بنائیں، اور ان کے ذریعہ بہار میں خوش گوار تبدیلیاں پیدا ہوں، مگر لمبے عرصے کے توقف کی وجہ سے یہاں کے عام لوگوں میں ایسا جمود پیدا ہو چکا ہے کہ ان کی حالت کو دیکھ کر دل روتا ہے، جگر پارہ ہوتا ہے، آنکھیں خون کے آنسو بہاتی ہیں، کبھی ڈر لگتا ہے کہ شاید کوئی معجزہ ہی ان کی حالت کو بدل سکے،..... بہر حال اہل درد اپنے افسانے جاری رکھے ہوئے ہیں اور یہ داستانیں انشاء اللہ اس وقت تک جاری رہیں گی جب تک کہ جسم وجان میں آخری قطرۂ لہو بھی باقی ہے۔

علمی اختلاف واتفاق

مولانا کی وسیع النظری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ باوجود اس علم وفضل کے قبول حق کے باب میں کافی فراخ دل تھے، اپنے کئی معاصرین سے ان کو علمی اختلاف تھا، مگر اس کی بنیاد ان کے خلوص پر تھی، وہ کسی بات کو دلائل کی بناپر صحیح یا غلط سمجھتے تھے، کسی دباؤ یا تعلق کی بناپر نہیں، جس بات کو وہ غلط سمجھتے تھے، خواہ وہ کتنی ہی بڑی شخصیت کی طرف سے پیش کی جائے، یا ان کی کوئی محبوب ترین شخصیت بھی اس کی قائل ہو وہ قبول نہیں کرسکتے تھے، بلکہ برملا اس سے اختلاف کرتے تھے، اس معاملے میں ان کے یہاں مصلحت کا کوئی خانہ نہیں تھا، میرے سامنے اس کی کئی مثالیں ہیں، میں ان میں سے ایک دو مثال پیش کرتا ہوں:

☆ عنین (نامرد) کا ایک مقدمہ دارالقضاء امارت شرعیہ پٹنہ میں پیش ہوا، دارالقضاء نے جو فیصلہ کیا دارالعلوم دیوبند نے بھی اس کی توثیق کی، مگر مولانا کو ذاتی طور پر کچھ ایسے حقائق کا علم ہوا جس کی وجہ سے انہوں نے اس فیصلہ سے اختلاف کیا، اور پوری ایک کتاب اس کے خلاف لکھ ڈالی، جو "نعیم اختر" ان کے تاریخی نام سے شائع ہوئی۔

☆اسی طرح انشورنس کے مسئلے پر مولانا کا اختلاف کافی مشہور ہوا، یہ فیصلہ پہلے مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ نے کیا تھا، اس کی تائید بعد میں دارالعلوم دیوبند کے مفتیان اور اساتذۂ کرام نے کی، سب سے آخر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اس فیصلہ کی توثیق وتصویب کی،.....مولانا کو اس سے اختلاف تھا، انہوں نے برملا اس کا اظہار کیا، المآثر کے جس کے وہ ایڈیٹر تھے، کئی شماروں میں اس تعلق سے مضامین شائع کئے۔

ایک بار اسی موضوع پر میرا ایک مضمون ماہنامہ حسامی حیدرآباد میں شائع ہوا، جس کا میں ایڈیٹر تھا، مضمون میں مسئلہ کا علمی تجزیہ پیش کیا گیا تھا، کسی رجحان کی وکالت مقصود نہیں تھی.....، المآثر کے صفحات پر مولانا نے اس کا جواب شائع فرمایا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس بات کو مولانا حق سمجھتے تھے اس کے اظہار میں ان کو کوئی تامل نہیں ہوتا تھا، وہ ایک بے باک اور بے لوث عالم دین تھے، مولانا کا ردعمل خواہ کتنے ہی سخت لب ولہجہ میں آیا ہو وہ ان کے اخلاص پر مبنی ہوتا تھا، اس میں کسی تعصب وتنگ نظری یا جانبداری کو دخل نہیں تھا۔

میں مولانا کا شاگرد تھا، بہت سے دقیق علمی مسائل میں ان سے رجوع کرتا تھا، لیکن اگر کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تو وہ اس کو منوانے پر اصرار بھی نہیں کرتے تھے، وہ دلیلوں سے بات ماننے کے قائل تھے، زبردستی نہیں، میرے سامنے اس کے کئی شواہد ہیں، تفصیل کا موقعہ نہیں صرف ایک دو چیز بطور مثال پیش کرتا ہوں:

پیر طریق کی موجودگی میں دوسرے پیر کی طرف رجوع

تصوف کے مسائل میں ایک اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی شیخ سے بیعت ہو جائے اور کچھ عرصہ گذر جانے کے باوجود اسے خاطر خواہ فائدہ کا احساس نہ ہو تو کیا شیخ کی حیات میں اس کی اجازت ورضا کے بغیر دوسرے شیخ سے تجدید بیعت کر سکتا ہے؟

اس معاملہ میں مولانا کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تجدید بیعت کر سکتا ہے، بیعت کرنے سے بیعت

لازم نہیں ہوتی بلکہ اصل مقصود فائدہ ہے، فائدہ محسوس نہ ہو تو دوسرے شیخ سے بیعت کر سکتا ہے،.....

مولانا نے اپنے اس نقطۂ نظر کا اظہار اپنے مضمون "تصوف ایک تعارف" میں کیا ہے، جو پہلی بار رسالہ دارالعلوم دیوبند کے الاحسان نمبر میں شائع ہوا، بعد میں اس کو الگ کتابی صورت میں بھی چھاپ دیا گیا ہے، میں اسی الاحسان نمبر سے مولانا کی عبارت نقل کرتا ہوں:

> "اگر کوئی شخص ایک شیخ کی خدمت میں خوش اعتقادی کے ساتھ ایک معتد بہ مدت تک رہے، مگر اس کی صحبت میں کچھ تاثیر نہ پائے تو دوسری جگہ اپنا مقصود تلاش کرے، کیونکہ مقصود خدا تعالیٰ ہے نہ کہ شیخ، لیکن شیخ اول سے بد اعتقاد نہ ہو، ممکن ہے کہ وہ کامل و مکمل ہو مگر اس کا حصہ وہاں نہ تھا،.....البتہ بلاضرورت محض ہوسناکی سے کئی کئی جگہ بیعت کرنا بہت برا ہے، اس سے بیعت کی برکت جاتی رہتی ہے، اور شیخ کا قلب مکدر ہو جاتا ہے اور نسبت قطع ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور ہر جائی مشہور ہو جاتا ہے"[17]

اسی الاحسان نمبر میں میرا بھی ایک مضمون "صوفیت ایک تعارف" کے عنوان سے شائع ہوا تھا،.....میں نے اس تعلق سے مولانا کو خط لکھا، مولانا نے جواب دیا مگر کئی بار کی مراسلت کے بعد بھی بات میری سمجھ میں نہیں آئی، مولانا نے بھی اپنے خطوط میں زیادہ تفصیل سے کام نہیں لیا، اور دلائل کے بارے میں مجھ پر ذمہ داری ڈال دی کہ دلائل خود تلاش کر لو،.....اس طرح مولانا اپنے نظریہ پر قائم رہے اور مجھے علم و تحقیق کے حوالہ کر دیا، اور اپنا نظریہ مجھ پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی.....

میری رائے اخیر تک یہ رہی اور آج بھی میری یہی رائے ہے کہ انسان ارادت قائم کرنے میں جلدی نہ کرے، بلکہ شیخ کامل کی تلاش و جستجو میں وقت صرف کرے اور جب کوئی شخص ہر طرح اس کے عقیدہ و نظریہ اور شریعت کی کسوٹی پر کھرا اترے تو اس سے بیعت ہو جائے، حضرت مجدد صاحبؒ نے شیخ کامل کی تلاش پر اپنے مکتوبات میں بہت زور دیا ہے، اس کا مطلب ہے کہ مرد متقی کی تلاش پہلے ہونی

---

17 - رسالہ دارالعلوم الاحسان نمبر اپریل تا جون ۱۹۹۳ء، ص ۳۹

چاہئے، بیعت ہونے کے بعد اس کے زہد و تقویٰ کو اپنے معیار پر نہیں تولنا چاہئے اور نہ ظاہری فائدہ اس باب میں کوئی معیار ہے، اس لئے کہ کبھی فوری فائدہ محسوس نہیں ہوتا یا فائدہ ہوتا ہے لیکن بسا اوقات طالب کو اس کا احساس نہیں ہوتا، اس لئے شروع کی بے کیفی، اضمحلال یا نفع کے عدم احساس سے انسان کو بد دل نہیں ہونا چاہئے،.....

بہر حال یہ کوئی شرعی مسئلہ تو ہے نہیں کہ قرآن وحدیث میں اس کا مأخذ تلاش کیا جائے، یہ طریقت کا مسئلہ ہے، صوفیا کی کتابوں سے اس میں رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے، میرا یہ خیال لفظاً یا معناً متعدد صوفیاء طریق کے یہاں موجود ہے، مثلاً متقدمین صوفیا میں حضرت مخدوم شرف الدین یحیٰ منیریؒ اونچے درجے کے مشائخ طریق بلکہ مجددین طریق میں گذرے ہیں، ان کے مکاتیب تصوف میں سند کا درجہ رکھتے ہیں، ان کے ایک طویل مکتوب کا یہ اقتباس اس معاملے میں کافی صریح اور چشم کشا ہے:

"لیکن چوں با پیرے صحبت کرد بے اجازت وے از آنجا نرود واز صحبت وے جدا نہ گردد، ایں نگاہ دارد وبر جملہ از غیرت پیراں احتراز باید کرد، اگر بے اجازت ایشاں یا بر طریق بطلان از پیر اول نزد پیر دیگر شود روا نباشد ہر کہ چنیں کند مرتد طریق باشد (مکتوب پنجم در طلب پیر والحاح در دعاء وسوال)

"(ترجمہ) بہر کیف مسئلہ یہ ہے کہ جب کسی پیر کی صحبت اختیار کرلی، تو بغیر اجازت اس کی صحبت سے الگ نہیں ہو سکتا اور دوسرے پیر کی طرف رجوع نہیں کر سکتا، اس امر کی سخت نگہداشت رکھنی چاہئے، اور پیروں کی غیرت سے بچنا چاہئے، کیونکہ اگر بغیر اجازت یا بطریق بطلان اپنے پیر کو چھوڑ کر مرید دوسرے پیر کی طرف رجوع کرے گا تو وہ مرتد طریقت ہو گا[18]

---

[18] ۔مکتوبات صدی مع ترجمہ حضرت سید شاہ نجم الدین فردوسی ص ۴۷ ناشر بیت الشرف خانقاہ بہار شریف ۱۹۷۳ء

رسالہ المجیب پھلواری شریف میں حضرت مولانا شاہ علی سجاد نعمتی پھلواریؒ کا ایک فارسی مکتوب جناب مولوی حکیم سید محمد یوسف پھلواروی کے ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے، اس میں بھی یہی مضمون تفہیم کے انداز میں آیا ہے:

"بہر کیف وہر قدر کہ ممکن باشد بر معمولات مستقیم باشند واز توقف حصول بے دل نشوند انشاء اللہ ظہور مقصود خواہند یافت، امیدواراں ماہہا وسالہابر در کافراں وعملہ روبرائے روز گار تگ ودو میکنند وسودے نمی بخشد اگر دربار گاہ جہاں آفریں بے نیاز دربر آمد کار توقف رونمود جائے بے دلی نیست، ثمرۂ پریشانی دنیا بجز خسراں ونقصان نیست، وحیرانی وپریشانی درراہ خدادریں جہاں ودرآں جہاں ثمرہ می دہد۔

"(ترجمہ) جس طرح اور جس قدر بھی ممکن ہو معمولات پر قائم رہیں، حصول مراد میں توقف کی وجہ سے بے دل نہ ہوں انشاء اللہ نفع ہو گا اور مقصود حاصل ہو گا، امیدوار مہینوں اور سالہا سال کافروں اور ان کے عملوں کے دروازے پر دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا اگر جہاں آفریں بے نیاز کی بارگاہ کے دروازے پر حصول مقصود میں توقف رونما ہو تو بے دلی کی کوئی وجہ نہیں ہے، دنیاوی پریشانی کا ثمرہ نقصان اور گھاٹے کے سوا کچھ نہیں لیکن خدا کی راہ میں حیرانی اور پریشانی دونوں جہان میں نفع بخش ہے[19]

دوسرے صوفیاء کے یہاں بھی یہ مضمون آیا ہے تحقیق پر بہت سے حوالے جمع کئے جاسکتے ہیں

قبول حق میں فراخ دل

☆ حضرت مولانا کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے شخص کی بات کو بھی بڑی توجہ کے ساتھ سنتے تھے اور کوئی بات ان کی رائے خلاف حق معلوم ہوتی اسے قبول کر لیتے تھے،

---

[19] - رسالہ المجیب پھلواری شریف پٹنہ ص ۳۴ شمارہ ا ج ۱۱ ماہ رمضان ۱۳۸۹ھ مطابق نومبر ۱۹۶۹ء

اپنے ذاتی تجربات سے اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں:

غالباً دارالعلوم دیوبند میں میرا ہفتم عربی کا سال تھا، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی معرکۃ الآراء کتاب "تحذیر الناس" میرے مطالعہ میں آئی، حضرت ناناتوی نے ختم نبوت کی جو دل نشیں تشریح فرمائی ہے، مجھے بہت پسند آئی، ابتدا میں مولانا کو بکثرت اپنی زیر مطالعہ کتابوں کا حاصل مطالعہ بھی لکھ کر میں بھیجا کرتا تھا اور مولانا اس کی تصویب و تصحیح فرمایا کرتے تھے، میں نے تحذیر الناس کی روشنی میں اپنی کچھ گذارشات مولانا کی خدمت میں بھیجیں، اس میں ایک مسئلہ اشیاء کی صفات ذاتیہ اور عرضیہ کا تھا، میں نے لکھا کہ اشیاء کی صفات ذاتیہ کبھی زائل نہیں ہوتیں اور نہ ان کو لانے کے لئے کسی خارجی تدبیر یا عرض عارض کی ضرورت ہوتی ہے، البتہ صفات عرضیہ زائل ہو سکتی ہیں، اسی طرح ان کو لانے کے لئے بھی کسی تدبیر کی ضرورت پڑتی ہے، میں نے پانی کی مثال دی کہ اس کی صفات ذاتیہ میں رقت وسیلان کے علاوہ برودت بھی ہے، وہ اس سے کبھی زائل نہیں ہو سکتی، عام طور پر کتب فقہیہ میں پانی کی صفات ذاتیہ میں صرف رقت وسیلان کا ذکر کیا گیا ہے، برودت کا ذکر نہیں آیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہاء نے یہ بات ازالۂ نجاست کے ضمن میں لکھی ہے اور اس میں برودت وحرارت سے فرق نہیں پڑتا، بلکہ رقت وسیلان سے فرق پڑتا ہے، فقہاء حقائق اشیاء بیان کرنے کے لئے نہیں بیٹھے ہیں بلکہ وہ اغراض ومقاصد کو ہدف بناتے ہیں..... بہر حال مولانا کو میرا یہ خط ملا تو پہلی فرصت میں اس کا جواب دیا اور میری اس بات پر نکیر بھی فرمائی، مولانا نے تحریر کیا کہ برودت پانی کی صفات ذاتیہ میں نہیں ہے، اس پر تم غور کرو،..... اتفاق سے حضرت نانوتویؒ ہی کی ایک کتاب میں مجھے یہ بحث مل گئی اور میں نے اس کو مستدل بنا کر برودت کے صفت ذاتی ہونے پر اصرار کیا، میں نے عرض کیا کہ برودت پانی سے کبھی زائل نہیں ہوتی، انتہائی گرم پانی میں بھی برودت باقی رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر جلتی ہوئی آگ پر کھولتا ہوا پانی ڈال دیں تو آگ بجھ جاتی ہے، اگر برودت زائل ہو گئی ہوتی اور حرارت اصلیہ پیدا ہو چکی ہوتی تو اس سے آگ کی حرارت دوچند ہونی چاہئے، اس لئے کہ حرارت حرارت سے بڑھتی ہے، ختم نہیں ہوتی، نیز حرارت کو لانے کے لئے تدبیر کرنی پڑتی ہے، زائل کرنے کے لئے نہیں، پانی کو

چھوڑ دیجئے خود بخود اس کی حرارت ختم ہو جائے گی اور برودت اصلیہ ظاہر ہو جائے گی، برودت کو واپس لانے کے لئے کسی عمل کی حاجت نہیں ہے، یہ واضح دلیل ہے کہ برودت پانی کی صفات اصلیہ میں سے ہے۔

مولانا کو میری بات میں وزن محسوس ہوا اور اس کو قبول کیا اور لکھا کہ میرے خط سے اس حصہ کو قلمزد کر دو،..... یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ مولانا قبول حق کے باب میں تنگ نظر نہیں تھے، وہ بڑے اور معاصرین تو کجا اپنے چھوٹوں کی بات کا بھی لحاظ کرتے تھے اور جب بھی انہوں نے اصرار کیا تو حق سمجھ کر کیا، تعند و تعصب کی بناپر نہیں، اگر اس بات میں وہ خطاپر بھی ہوں تو ایک اجر کے بہر حال مستحق ہیں۔

مولانا سے میری مراسلت

مراسلت کا ذکر آیا ہے تو کچھ اپنی مراسلت کے احوال بھی بیان کر دوں، علمی مراسلت کا شوق مجھے غازی پور کی طالب علمی کے زمانہ میں پیدا ہوا، میں عربی دوم کا طالب علم تھا، ایک علمی مسئلہ پر میرے گاؤں کے ایک بزرگ صاحب علم جناب مولانا عبد الصمد صاحب مرحوم جو اس زمانہ میں مدرسہ ریاض العلوم گورینی ضلع جونپور یوپی میں مدرس تھے، سے میری مراسلت ہوئی، طالب علمی کا وقت، میرا مطالعہ ہی کیا تھا، مگر ایک رد عمل کے نتیجہ میں اس مراسلت کا سلسلہ شروع ہوا، اس کے بعض نمونے میرے پاس آج بھی موجود ہیں، ان کو پڑھتا ہوں تو بے اختیار ہنسی چھوٹ جاتی ہے، مواد سے زیادہ الفاظ کا کھیل تھا، اور بزرگانہ حدود کی بھی اس میں رعایت نہیں تھی، جیسے وہ کسی جذبۂ انتقام کے تحت مناظرانہ انداز میں لکھی جارہی ہوں، اور زبان خالص پرانے دور کی عربی آمیز استعمال کی گئی تھی،..... بزرگانہ حدود کی رعایت ملحوظ نہ رہنے کی بناپر اس جرم کی شکایت انہوں نے اپنے مدرسہ کے بزرگ استاذ حدیث حضرت مولانا افضال الحق جوہر قاسمیؒ جو ہمارے مولانا کے بھی استاذ تھے، سے کی، مولانا افضال صاحبؒ نے ایک خط مولانا اعجاز احمد صاحبؒ کے پاس فرد جرم عائد کر کے بھیج دی، اس طرح مولانا کو میری مراسلت کا پتہ چلا، مولانا نے مجھے بلا کر اس تعلق سے استفسار کیا، جب میں نے پوری صورت حال بتائی، تو

کافی دیر تک محظوظ ہوئے اور یہی عربیت آمیز مکاتبت اگلے تعلیمی سال (عربی سوم) میں میرے نائب معلن انجمن نامزد کئے جانے کا سبب بن گیا، بہر حال اس کے بعد غازی پور میں پھر دوبارہ کسی مکاتبت کا موقعہ نہیں ملا۔

دیوبند پہونچا، مولانا سے دوری ہوئی، کتابوں کا مطالعہ بڑھا، کچھ الجھنیں پیدا ہوئیں تو پھر مولانا سے مراسلت کا سلسلہ شروع ہوا، میں خواہ مخواہ خط لکھنے کا قائل نہیں تھا، اپنی خبر خیریت کو میں اتنی اہمیت نہیں دیتا تھا کہ اس کیلئے استاذ محترم کے قیمتی اوقات کا کچھ حصہ ضائع کیا جائے، میرا خیال تھا کہ استاذ کے پاس جائیں یا ان سے مراسلت کریں تو کسی علمی مسئلہ کی تحقیق و تشریح کے لئے جائیں، اسی لئے میری مکاتبت چند اساتذہ تک محدود رہی، مجھے بعد میں اپنی اس کمی کا احساس ہوا لیکن وقت گذر چکا تھا۔

بہر کیف مختلف علمی مسائل پر مولانا سے مراسلت کا سلسلہ عربی ہفتم کے سال شروع ہوا، دارالعلوم دیوبند کا ماحول میرے لئے نیا تھا اور اساتذۂ دارالعلوم سے تعارف نہ ہونے کی بناپر ان کی خدمت میں حاضری اور اپنی علمی مشکلات کی گرہ کشائی کی درخواست کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، اس لئے مولانا سے تعلق اوران کی دریادلی کو دیکھتے ہوئے آسان یہی محسوس ہوتا کہ مولانا سے ہی مراجعت کی جائے،..... نیز یہ احساس بھی ہمہ وقت دامن گیر رہتا تھا، کہ مولانا کی نگاہ سے اوجھل ہونے کے بعد ان کو ہمارے علمی اشتغال کا پتہ چلتا رہے، اور ان سے اظہار تعلق بھی رہے، اس لئے کہ ہماری علمی ترقی سے جو خوشی مولانا کو ہوسکتی تھی وہ اس وقت دنیا میں شاید کسی کو نہ ہوسکتی تھی، انہوں نے ہمیں اپنے بچوں کی طرح پالا تھا، اور دیوبند کے وسیع علمی ماحول میں اس لئے بھیجا تھا کہ علم و فن کا جو تخم انہوں نے ہمارے قلب ودماغ کی زمین پر بویا ہے وہ کس حد تک برگ وبار لاتا ہے؟ اور ہمارے خرمن جستجو کو جس خون جگر سے انہوں نے سینچا ہے، دیوبند کی آب وہوا میں وہ کس حد تک بہار آشنا ہوتا ہے؟ اس لئے مولانا کو ہمیشہ ہمارے خطوط اور علمی روداد سفر کا انتظار رہتا تھا، کبھی دیر ہوتی تو اس کا شکوہ فرماتے، مولانا اس باب میں بہت حساس تھے، اور شدت تعلق کی بناپر کبھی بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پر گرفت فرماتے تھے، مولانا خود فرماتے تھے کہ میں محبت کا مریض ہوں، اس لئے محبت کا گھاؤ ان کے لئے بہت گہرا ہوتا تھا، ہمیں اس

وقت مولانا کے اس درد و غم کا پورا احساس نہ تھا، لیکن بعد میں جب ہم نے عملی زندگی میں قدم رکھا اور کبھی اسی قسم کے صبر آزما حالات سے دوچار ہونا پڑا تو مولانا کا رنج و غم یاد آیا اور پورا وجود ندامت سے عرق عرق ہو گیا کہ ہم نے اپنی بے حسی سے مولانا کو کتنی تکلیفیں پہونچائیں، پھر مولانا کے وہ جملے یاد آئے جو انہوں نے انتہائی رنجیدگی کے عالم میں کئی بار مجھے لکھے تھے، لیکن میں اپنی نادانی کی وجہ سے ان کے اندر چھپے ہوئے اس کرب کو نہ جان سکا اور ناز پروردہ صاحبزادوں کی طرح ان کے احوال دل سے غافل رہا، اللہ پاک مجھ پر رحم فرمائے اور مولانا کی روح پر بھی رحمتوں کی بارش فرمائے، ان کو سکون ابدی نصیب فرمائے آمین، سوچتا ہوں، کسی نے کسی سے اسی عالم میں یہ شعر کہا ہو گا:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

میری بعض نادانیوں سے مولانا کو تکلیف بھی پہونچی، لیکن اس کے باوجود وہ مجھ سے بے پناہ محبت اور حسن ظن رکھتے تھے، ان کو مجھ سے قطع تعلق گوارا نہیں تھا اور نہ میرا علمی و فکری معیار فروتر دیکھنا چاہتے تھے، پتہ نہیں میں مولانا کی امیدوں پر اتر سکا یا نہیں لیکن بہر حال اپنے آخری دور میں وہ اپنے جذبۂ شفقت و محبت سے مجبور ہو کر جیسا بھی میں تھا انہوں نے مجھے گلے لگالیا، مجھے کئے علمی مسائل پر مولانا سے اختلاف تھا اور مولانا نے پوری کوشش فرمائی کہ وہ اپنے نقطۂ نظر سے مجھے مطمئن فرمائیں ،لیکن اپنی علمی بے بضاعتی کی وجہ سے مجھے شرح صدر نہیں ہو سکا، مولانا کچھ جھنجھلائے بھی، لیکن میری روش میں فرق نہیں آیا، مجبوراً مجھے برباد ہونے سے بچانے کے لئے مولانا ہی محبت سے ہار گئے اور مولانا کے سامنے میری ایک نیاز مندی نے میرا سارا قصور دھو ڈالا، آخر مولانا فرشتۂ محبت تھے، ان کی کتاب زندگی میں وصل کے علاوہ فصل کا کوئی عنوان ہی نہیں تھا، (الا یہ کہ دینی الحاد و زندقہ کا معاملہ ہو)

دیوبند کے پانچ سالہ قیام کے دوران مولانا سے میری جو مراسلت ہوئی اس کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا، وہ اس طرح کہ دارالعلوم کی معین مدرسی کے اختتام پر جب میں پورے ساز و سامان کے ساتھ

اپنے گھر واپس آرہا تھا، تو سامان کا وزن زیادہ ہونے کی بنا پر میں نے اپنی کتابوں اور کاغذات کا ایک بڑا کارٹون ریلوے ڈاک کے حوالہ کر دیا، جو مہینوں نہیں ملا، سعی بسیار کے بعد مجھے سمستی پور ریلوے اسٹیشن کے پارسل گودام میں وہ کارٹون کھلی ہوئی حالت میں ملا، دیکھا تو اس کا سب کچھ نکل چکا ہے اور کچرا بھرا پڑا ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون،.....ہندوستان کی ریلوے ڈاک پر اس دن جو بے اعتباری قائم ہوئی آج تک ختم نہ ہو سکی،.....مولانا کے خطوط بھی ریلوے ڈاک کے اسی مقبرہ میں دفن ہو گئے، آج جب مولانا نہیں ہیں تو اس درد میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے،.....دو چار خطوط باقی رہ گئے ہیں، اپنے سینہ کے داغوں کو تازہ کرنا ہوتا ہے تو انہی کو نکال کر دیر تک الٹتا پلٹتا رہتا ہوں اور تھوڑی دیر کے لئے آج کی مصروف دنیا سے نکل کر اپنے ماضی کے بچپن میں پہونچ جاتا ہوں، مولانا اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

آج مولانا ہمارے درمیان نہیں ہیں، تو ان کی ایک ایک بات یاد آرہی ہے، ایک بار جب میں مدرسہ دینیہ کا طالب علم تھا، میرے والد ماجد کو مولانا نے تحریر فرمایا:

"ماشاء اللہ اختر سلمہٗ مدرسہ کا سب سے ممتاز طالب علم ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی اور میری آرزو پوری کرے کہ وہ ایک جامع علم و عمل عالم بنے اور وہ خود بھی اپنے علم سے نفع اندوز ہو اور دوسرے بھی اس سے فیضیاب ہوں۔ اعجاز احمد اعظمی"[20]

میرے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا:

"واپسی پر تمہارا خط ملا، پڑھا اور دل میں غیر معمولی مسرت محسوس ہوئی، بحمد اللہ میری آرزوؤں کی تکمیل حق تعالیٰ تمہاری ذات سے کرا رہے ہیں، میں نے اول بھی یہی چاہا اور آخر بھی یہی تمنا ہے کہ میرے دوستوں کی زندگی خدمت دین

---

20 ۔مکتوب ۲۷/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۴ھ

کے لئے وقف رہے، بحمد اللہ تمہارے اندر استعداد ہے اور حق تعالیٰ نے مواقع بھی عنایت فرمائے ہیں،..... میں دن رات تمہارے لئے دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ حیاۃ طیبہ عنایت فرمائیں، علم و عمل کی حرص نصیب فرمائیں، اخلاص و محبت ارزانی فرمائیں، قبولیت و محبوبیت سے نوازیں، دنیا و آخرت میں سرخرو و شاد کام بنائیں۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد[21]

قصہ میری پہلی تالیف کا

☆ قیام دیوبند کے آخری سالوں میں میری پہلی کتاب "منصب صحابہ" شائع ہوئی اور اس کی اشاعت بھی ایک ڈرامائی صورت اختیار کر گئی، اس کتاب کی اشاعت نہ ہوتی تو شاید مجھ سے کوئی ناراض نہ ہوتا، صرف ناشر کتاب جو اب سعودی میں رہتے ہیں، مجھ سے ناراض ہو جاتے، اس لئے کہ کتاب کی اشاعت کا معاملہ ان سے مکمل ہو چکا تھا،..... لیکن کتاب کی اشاعت سے جماعت اسلامی کے احباب کو کوئی غصہ آیا یا نہیں، اس لئے کہ اس مسئلہ کا براہ راست تعلق انہی سے تھا؟ اس کا پتہ نہیں چل سکا،..... لیکن میرے اپنے ہی کئی بزرگ مجھ سے ضرور ناراض ہو گئے اور ہر ایک کی ناراضگی محبت و اخلاص ہی کی وجہ سے تھی اور سب کے پیش نظر میری ہی فلاح و ترقی تھی۔

واقعہ یہ ہوا کہ کتابت کا مرحلہ مکمل ہونے کے بعد ناشر کتاب نے اپنے طور پر حضرت اقدس محدث اکبر جامع المعقول والمنقول حضرت علامہ محمد حسین بہاریؒ محدث دارالعلوم دیوبند اور فقیہ ملت، مفتی کبیر حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ مفتی دارالعلوم دیوبند سے کتاب دکھلا کر تقریظات لکھوالیں، علامہ بہاریؒ تقریظ کے معاملہ میں سخت مشہور تھے، لیکن ازراہ عنایت مولانا مرحوم نے بھی تقریظ لکھی اور عادت کے خلاف زور دار لکھی، ان دو بزرگوں کی تقریظات کے حصول میں ہمارے ناشر کتاب صاحب کی سعی و محنت کا براہ راست دخل تھا، ان دونوں بزرگوں کی تحریرات حاصل ہونے کے بعد ناشر صاحب بعجلت اس کتاب کو پریس کے حوالہ کرنا چاہتے تھے اور اس میں کسی تاخیر کے روادار نہ

---

21 ۔ مکتوب یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

تھے، لیکن میں نے اصرار کے ساتھ ایک دو بزرگوں سے اور ملنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ اسی ضمن میں میں نے حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوریؒ سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور معروف ادیب ومحدث حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ سے ملاقات کی، حضرت مفتی سعید احمد صاحبؒ کو اولاً اس رسالہ کے بنیادی تصورات ومضمرات سے اختلاف ہوا، لیکن پھر جلد ہی ان کو شرح صدر ہو گیا اور اس پر ایک زوردار علمی مبسوط مقدمہ لکھا، حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ نے اس کو حلقۂ دیوبند کی طرف سے مسئلہ معیار حق کی پہلی مستند تشریح قرار دیا اور اسی لئے ان دونوں بزرگوں کی متفقہ رائے ہوئی کہ یہ علماء دیوبند کا ایک نظریاتی مسئلہ ہے، جس کی اس کتاب میں معتبر انداز میں وکالت کی گئی ہے، اس لئے اسکی اشاعت دارالعلوم دیوبند کی شیخ الہند اکیڈمی کی طرف سے کی جانی چاہئے،..... میرے لئے یہ ایک انتہائی سعادت کا مقام تھا، جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا،..... لیکن یہ بات جب ہمارے ناشر صاحب کو معلوم ہوئی تو گویا ان کے پاؤں تلے زمین نکل گئی، سخت چراغ پا ہوئے اور اس کو انہوں نے معاملہ کی خلاف ورزی اور بدعہدی قرار دیا.....اور آخر وہ جنگ جیت گئے ..... انہوں نے ہمارے دونوں بزرگ حضرت علامہ بہاریؒ اور حضرت مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ کو اعتماد میں لیکر کتاب کا مسودہ اپنے قبضہ میں لے لیا، دیوبند کے در و دیوار پر اس کے اشتہاری پمفلٹ شائع کئے اور اس کے کچھ دنوں کے اندر ہی کتاب منظر عام پر آگئی، اس طرح میری زندگی کی پہلی کتاب میرے آرزوؤں کے خون سے تیار ہوئی اور میری تمناؤں کے کھنڈرات پر میری شہرت کی پہلی عمارت تعمیر ہوئی، اب میں نہ حضرت مفتی سعید صاحب پالنپوریؒ کو منہ دکھانے کے لائق تھا اور نہ حضرت مولانا ریاست صاحبؒ کو، جو اس وقت شیخ الہند اکیڈمی کے ڈائریکٹر تھے،.....ایک مدت کے بعد اپنی کتاب لیکر ان دونوں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت مولانا ریاست صاحب نے تو بزرگانہ تحمل سے کام لیا، لیکن حضرت مفتی سعید صاحبؒ مجھ سے بہت محبت فرماتے تھے اور میرے بہتر مستقبل کے آرزومند تھے، مجھ پہ سخت ناراض ہوئے اور بہت زجر وتوبیخ فرمائی، ان کو اس خوبصورت موقعہ کے ضائع ہونے کا بہت افسوس تھا، افسوس تو مجھے بھی تھا، لیکن معاملہ پہلے طے ہو چکا تھا اس لئے از روئے شرع مجبور تھا۔

دوسری طرف میری دلی خواہش تھی کہ یہ کتاب چھپنے سے قبل حضرت مولانا اعجاز احمد صاحبؒ کی خدمت میں بھی پیش کروں، اس لئے کہ میرے سلیقۂ تحریر میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ حصہ انہی کا ہے، یہ قلم میرے ہاتھوں میں انہی کا پکڑایا ہوا ہے، اس لئے اپنی اس پہلی کتاب میں اپنے پہلے محسن کو میں کیسے فراموش کر سکتا تھا، یہ کتاب میری نہیں ان کی تھی، یہ اسی تخم اولین کا برگ وبار ہے جو مولانا نے غازی پور میں ڈالا تھا،..... مجھے احساس تھا کہ وہ اپنے اس نیاز مند کی پہلی کتاب اور اپنی محنت کا پہلا پھل دیکھ کر اتنا خوش ہونگے جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا،..... لیکن بد قسمتی سے ایسی ڈرامائی صورت پیدا ہوئی کہ اس کے لئے موقعہ نہیں نکل سکا، کتاب چھپنے کے بعد مارے شرم کے میں چھپتا رہا، نہ ملنے کی طاقت، نہ خط لکھنے کا یارا، میں نے خوف سے ایک عرصہ تک مولانا کو کتاب نہیں بھیجی کہ مولانا کو تکلیف ہوگی اور ان کو خدانخواستہ نظر انداز کئے جانے کا احساس ابھرے گا، اسی بیچ غازی پور کا میرا ایک ناگہانی سفر بھی پیش آیا، جی چاہا کہ اپنے مرکز محبت کا سامنا کروں مگر میرے اندر اس کی ہمت نہیں تھی،..... لیکن کب تک؟ ایک نہ ایک دن مولانا کو خبر ہونی ہی تھی..... آخر ہوئی اور کچھ دوستوں کی کرم فرمائی بھی شامل رہی، مولانا نے اس پر انتہائی رنج کا اظہار فرمایا، اور اپنے ایک خط میں دل کا درد کھول کر رکھدیا، خوب زجر وتوبیخ فرمائی..... اور پوری زندگی گذر گئی مجھے اپنا قصۂ عذر بیان کرنے کی مہلت نہ مل سکی، ایک مجرم کی طرح سب کچھ میں نے خاموشی کے ساتھ سن لیا، اس پس منظر میں مولانا کا یہ مکتوب رنج پڑھئے، جس کے حرف حرف سے محبت ٹپکتی ہے:

> "دوسری چیز جو میرے لئے باعث تکلیف بنی وہ یہ کہ تمہاری پہلی تالیف آئی، مگر تم نے مجھے اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی، بہت عرصہ کے بعد جبکہ وہ کتاب دوسرے ذرائع سے مجھے حاصل ہو چکی تھی، تب تم نے بھیجی، جبکہ میرے خیال میں تمہارے سلیقۂ تحریر وتقریر میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ دخل میرا تھا، مجھے محسوس ہوا کہ تم مجھ سے دوری اختیار کر رہے ہو، اسی احساس نے الجھن پیدا کی اور یہ احساس اس وقت اور زیادہ ہوا، جب تم نے غازی پور، مئو اور جہانا گنج

کا سفر کیا، اور اگر کوئی شخص لائق التفات نہیں تھا وہ میں تھا، تم سوچو کہ اگر میری جگہ تم ہوتے اور تمہارا کوئی عزیز ترین شاگرد جس کی تربیت و پرداخت میں تم نے اپنے ذہن و قلب کو مصروف رکھا ہو اور اس کے لئے خون جگر جلایا ہو، ایسی ہی بے التفاتی کر کے گذر جائے تو تم پر کیا گذرے گی، کیا یہ بات تمہارے سوچنے کی نہیں ہے"[22]

ظاہر ہے کہ مولانا کو جو بھی رنج پہونچا وہ صورت حال سے بے خبر ہونے کی بناپر، میرے بعض بہی خواہوں نے اسے خوامخواہ ہوا دی جس کی خبر میرے والد ماجد کو بھی پہونچ گئی، مولانا کی رنجیدگی سے والد صاحب کو دکھ ہوا انہوں نے کسی واقف کار کے ذریعہ صورت حال سے باخبر کرایا اور اپنے طور پر ایک سفارشی خط بھی لکھا، مولانا نے والد صاحب دامت برکاتہم کے جواب میں تحریر فرمایا:

"آپ کی یاد آوری کو اپنی خوش بختی اور سعادت تصور کرتا ہوں،..... عزیزم مولوی اختر امام عادل سلمہ کو ہرگز بھولا نہیں ہوں، بھلا ایسے عزیز دوست کو کون بھلا سکتا ہے، مگر عزیز موصوف سے کچھ نادانی ہوگئی، ان کے ہر خط کا میں نے جواب بھی دیا ہے، شاید میرا آخری خط انہیں نہیں ملا، یا ان کا کوئی ایک خط مجھے نہیں ملا، اسی میں مراسلت کا انقطاع ہوگیا، ان کے بعض کاموں کی وجہ سے مجھے کبیدگی ہوگئی تھی، میں نے اس پر تنبیہ بھی کی،..... کل پرسوں ان کا خط آیا جس میں انہوں نے تواضع اور خاکساری کا حق ادا کر دیا ہے، طبیعت بہت متأثر ہوئی، اب بحمد اللہ کسی طرح کا تکدر باقی نہیں رہا، یہ پورا واقعہ میں نے اس لئے لکھدیا تاکہ آپ کو کسی طرح کا خلجان نہ رہے، امید ہے کہ میری طرف سے جس تساہل اور فراموشی کا آپ کو احساس ہوا اس سے درگذر فرمائیں"[23]

---

22 ۔مکتوب ۱۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ

23 ۔مکتوب ۲۴/ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۱ھ

بہر حال میری تو کوئی لیاقت نہیں لیکن جو کچھ بھی الٹا سیدھا لکھنا پڑھنا آیا وہ سب مولانا ہی کی محنت اولین کا نتیجہ ہے، میں نے ہمیشہ مولانا کے سامنے سلسلۂ نیاز قائم رکھا، مولانا نے بھی ہمیشہ مجھے یہی احساس دلایا، ایک خط میں تحریر فرمایا:

"اس کا تصور تک مت کرنا کہ تم اونچی کتابیں پڑھاتے ہو، مضامین لکھتے ہو، لمبی تقریر کرتے ہو، تو میرے سامنے کچھ بڑے ہو گئے ہو، اپنے کو میرے سامنے وہی بچہ سمجھو جو ۸۰ء میں تھا[24]

درمیان میں کچھ نظری مسائل کو لیکر مولانا کو مجھ سے اختلاف رہا، مجھ کو نہیں، اس لئے کہ میں نے کبھی ایک لفظ بھی مولانا کی ذات یا ان کی کسی تحریر کے حوالہ سے لکھنے کی جرأت نہیں کی، ہمیشہ ادب میرے لئے مانع رہا، البتہ بعض مواقع پر مولانا نے حق استاذی ادا فرمایا اور میری تنبیہ کے لئے بعض چیزیں شائع فرمائیں، مجھے اس سے کبھی تکدر نہیں ہوا، علمی مسائل میں استاذ اور شاگرد کے مابین مکمل ہم آہنگی ضروری نہیں ہے اور نہ اس سے شاگردی کا رشتہ متأثر ہوتا ہے،...... دینی شخصیات کے بارے میں بھی مطالعہ و تجربہ میں فرق ہو سکتا ہے اور اس کی وجہ سے اختلاف رائے بھی ممکن ہے، بہر حال مولانا نے انتہائی خلوص کے ساتھ بعض علمی نظریات کو انتہائی تصلب کے ساتھ اختیار فرمایا اور میری رائے بصد ادب و احترام ان سے الگ رہی اور عجب نہیں کہ مولانا کی رائے ہی درست ہو لیکن میرے لئے وہ ناقابل فہم رہی۔

ذوق مناظرہ

مولانا کو ابتداء میں مناظرہ سے بڑی دلچسپی تھی، جیسا کہ انہوں نے اپنی خود نوشت میں بھی اس کا اظہار کیا ہے، ہم لوگوں نے جس دور میں ان کو دیکھا ان پر تصوف و احسان کا غلبہ تھا اور زیادہ تر ان کی توجہ علمی، فنی اور تحقیقی امور کی طرف رہتی تھی، ذوق مناظرہ میں اضمحلال ضرور آیا تھا لیکن ختم نہیں ہوا تھا، البتہ اب اس کا رخ تقریر کے بجائے تحریر کی طرف ہو گیا تھا، اسی زمانہ میں انہوں نے مسئلۂ عنین

24 ۔ مکتوب ۲ / رجب ۱۴۱۶ھ

پر تردیدی علمی مقالہ لکھا، جو "نعیم اختر" کے فرضی نام سے شائع ہوا، "بودم بے دال" رازداں کے نام سے لکھا، "ایک ذہنی طغیان کا احتساب" کے نام سے مسئلہ ایصال ثواب پر اپنے نام سے ایک کتاب تحریر فرمائی وغیرہ۔

مولانا ہم لوگوں میں بھی مناظرہ کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، ایک بار اس کی تربیت دینے کے لئے باقاعدہ مجلس مناظرہ منعقد فرمائی جس میں تمام اساتذہ وذمہ داران کے علاوہ کچھ معززین شہر نے بھی شرکت کی، طلبہ کی دو ٹیم بنائی گئی، دیوبندی اور بریلوی، دیوبندیوں کے ترجمان مولوی انعام غازی پوری مقرر ہوئے اور بریلویوں کے ترجمان مفتی نسیم احمد مظفر پوری مرحوم بنائے گئے ،میں عربی سوم میں تھا اور مفتی نسیم صاحب کا نائب تھا، مناظرہ زور دار اور دلچسپ رہا، تمام شرکاء نے اس کی داد دی، ہندوستانی مدارس میں اس وقت یہ اپنی نوعیت کا منفرد مناظرہ تھا۔

شاید مدرسہ دینیہ کی تاریخ میں اتنا خوبصورت دور پھر نہیں آیا۔۔۔ مولانا کا یہ رنگ ان کے بہت سے تلامذہ میں منتقل ہوا، مجھ پر بھی اس ذوق کا عرصہ تک غلبہ رہا اور تقریری وتحریری دونوں طرح کے مناظروں کا بارہا تجربہ ہوا

میری طالب علمی کے ایک مناظرہ کا دلچسپ قصہ

اس موقعہ پر غازی پور کے عہد طالب علمی کا ایک اور مناظرہ صفحۂ ذہن پر ابھر رہا ہے، جو ہم نے کسی استاذ کی سرپرستی کے بغیر انجام دیا تھا اور کامیاب رہے تھے،..... شہر میں کسی میلاد کے موقعہ پر ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا مختار احمد خیر آبادی دامت برکاتہم تقریر کے لئے مدعو تھے، اس میں شہر کے مشہور اور قدیم مدرسہ چشمۂ رحمت (جو اب بریلوی مکتب فکر کا نمائندہ ہے) سے بھی ایک استاذ تقریر کے لئے بلائے گئے تھے، جمعرات کی شام تھی، مولانا مختار صاحب کی مناسبت سے ہم چند ساتھیوں کی بھی ایک جماعت میلاد سننے کے لئے وہاں پہونچ گئی، پہلے مولانا مختار صاحب کی تقریر ہوئی اور وہ رخصت ہوگئے پھر بریلوی مقرر کا نمبر آیا اس نے مولانا کی تقریر کا محاسبہ کر ڈالا اور ایک نفرت کا ماحول پیدا ہوگیا، صاحب خانہ کے رعب داب سے ہم لوگ وہاں کچھ نہ بول سکے، لیکن دوسرے دن میں نے چند

ساتھیوں کے ساتھ چشمۂ رحمت پر دھاوا بول دیا، پہلے ہم نے مدرسہ کے باہر ایک چھوٹی سی مسجد میں پڑاؤ ڈالا اور وہاں سے مقرر موصوف کو مناظرہ کی دعوت پیش کر دی اور ایک چھوٹی سی تحریر بھیجی، لیکن انہوں نے غالباً بچوں سے منہ لگانا مناسب نہیں سمجھا اور مدرسہ سے باہر آنے کو تیار نہ ہوئے، تو ہم لوگ ہمت کر کے خود ہی مدرسہ کے اندر پہونچ گئے اور وہاں موجود لوگوں سے کہا کہ کل کی میلاد میں آپ کے مولانا صاحب نے بر سر مجلس ہمارے استاذ کی تردید و تضحیک کی ہے، اس لئے ہم ان سے اس موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں، وہ عوامی مجلس تھی اس لئے ہم خاموش رہے، لیکن آج اہل علم کے درمیان ہمیں ثابت کرنا ہے کہ حق پر کون ہے؟ آپ کے مولانا صاحب یا ہمارے استاذ صاحب؟..... چشمۂ رحمت کے طلبہ اور اساتذہ نے ہماری چرب زبانی دیکھی تو ایک بھی ہمارے قریب نہیں آیا اور نہ وہ مقرر صاحب اپنے حجرہ سے بر آمد ہوئے،..... تھوڑی دیر ہم لوگ وہاں ٹھہرے، پھر فتح مبین کے نعرے لگاتے ہوئے واپس مدرسہ دینیہ آ گئے، ہم لوگ مغرب بعد والی تعلیم سے غیر حاضر رہے اور عشاء کی نماز کے بہت بعد واپس ہوئے، ہمارے ساتھ طلبہ کا جم غفیر تھا، مدرسہ میں تمام اساتذہ اور طلبہ کو کانوں کان خبر ہو چکی تھی، مدرسہ کے قریب پہونچے تو ہم لوگ خاموشی کے ساتھ مدرسہ میں داخل ہو گئے، لیکن ہمارے پہونچتے ہی سارا مدرسہ اکٹھا ہو گیا، مولانا مختار صاحب تو گویا منتظر ہی بیٹھے تھے، پہلی فرصت میں ہمیں طلب کیا اور خوب مٹھائیاں کھلائیں،..... ہمارے اس مناظرہ کی یاد آج بھی اس مدرسہ کی چہار دیواری میں موجود ہے، ابھی چند ماہ قبل مدرسہ دینیہ حاضری کا موقعہ ملا تو مولانا مختار صاحب نے کئی بار اس واقعہ کا ذکر فرمایا۔

آج میں نے خواب کی تعبیر دیکھ لی.....

قیام غازی پور کا ایک واقعہ میرے لئے نیک فال اور نا قابل فراموش ہے، جی چاہتا ہے اس کو ذکر کر دوں، ایک موقعہ کی بات ہے، غالباً کوئی تعلیمی دن تھا، بمبئی کے کوئی معزز مہمان اچانک وارد ہوئے، حضرت مولانا عزیز الحسن صدیقی مہتمم مدرسہ اور حضرت مولانا مشتاق احمد غازی پوری صدر المدرسین ان کو لیکر عصر کے بعد شوکت منزل پہونچ گئے، ان کو اپنے مدرسہ کا معائنہ کروانا

تھا، مہتمم صاحب نے مولانا اعجاز صاحب سے کہا کہ مہمان محترم کے استقبال میں بعد نماز مغرب ایک استقبالیہ نشست ہونی چاہئے، جس میں کسی طالب علم کی تقریر بھی سنوائی جائے، ہفتہ کا درمیانی دن تھا کسی کو پوری تقریر یاد نہ تھی اور اچانک تقریر کرنے کی ہمت بھی نہ تھی، میری تلاش شروع ہوئی، میں اتفاق سے اپنے گاؤں کے کسی عزیز سے ملنے کے لئے ریلوے اسٹیشن گیا ہوا تھا، آدمی اسٹیشن چھوڑا گیا ،اور آناً فاناً مجھے طلب کیا گیا، میں پہونچا تو جلسہ کی کاروائی شروع کی جارہی تھی، ایک استاذ نے آہستہ سے مجھ سے پوچھا کوئی تقریر یاد ہے؟ ابھی اسی مجلس میں کرنی ہے، میں نے کہا یاد تو نہیں ہے لیکن حضرت ناناتویؒ کی ایک کتاب اسی ہفتہ پڑھی ہے، اس کو اپنے لفظوں میں بیان کردوں گا، بہر حال میرا نام پکارا گیا، میں ہانپتا کانپتا ڈائس پر پہونچا اور برجستہ اور بے خوف تقریر کی، تقریر سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ میں سوچ سمجھ کر بول رہا ہوں، تقریر رٹی ہوئی نہیں ہے، تقریر ختم ہوتے ہی شاباشیوں اور داد و تحسین کی آوازیں بلند ہوئیں، مہمان محترم بھی بہت متأثر دکھائی دیئے، مجھے خوب یاد ہے کہ حضرت مہتمم صاحب نے انتہائی خوشی اور سرمستی کے عالم میں یہ الفاظ اپنی تقریر میں کہے تھے کہ:

"میں نے اس مدرسہ کے تعلق سے جو حسین خواب دیکھے تھے آج میں نے ان کی تعبیر بھی دیکھ لی"

اور پورا مجمع صدائے سبحان اللہ سے گونج اٹھا، فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

منورواشریف کی آخری آمد

مولانا کو منورواشریف اور میرے والد صاحب دامت برکاتہم سے ہمیشہ تعلق رہا، شروع میں آمد ورفت زیادہ تھی،..... بعد میں کم ہوگئی تھی،..... عمر کا بھی تقاضا تھا، کچھ عوارض کے بھی شکار ہوگئے تھے،..... مگر والد ماجد کے دل میں ہمیشہ ان کی قدر رہی، مولانا بھی والد صاحب کی محبت کے آخر تک اسیر رہے اور جہاں بھی ملاقات ہوتی، یا تذکرہ ہوتا ان کا والہانہ پن محسوس ہوتا تھا، آخری بار جامعہ ربانی کے قیام کے بہت بعد تشریف لائے، ساتھ میں ان کے مخدوم دوست حضرت قاری شبیر احمد صاحب دامت برکاتہم ناظم مدرسہ اسلامیہ شکرپور بھروارہ ضلع دربھنگہ اور مولوی وصی احمد صاحب صدیقی دربھنگہ اور

مولانا کے صاحبزادہ مولانا راشد صاحب بھی تھے، مولانا در بھنگہ آئے ہوئے تھے، میری دعوت پر یہاں تشریف لائے، اس بار ان کا رنگ ہی کچھ اور تھا، وہی تنہائی و گوشہ نشینی جو مجھے روز اول (الٰہ آباد میں) نظر آئی تھی..... مدرسہ میں آپ کے استقبال کے لئے ایک جلسہ رکھا گیا جس میں طلبہ واساتذہ کے علاوہ عام لوگ بھی شریک ہوئے، عشاء کے بعد ایک گھنٹہ تنہا تقریر فرمائی، نہ کسی تعارفی گفتگو کی گنجائش چھوڑی اور نہ کسی دوسرے کو تقریر کی اجازت دی، ہم لوگ قاری شبیر صاحب سے بھی سننا چاہتے تھے، وہ پہلی بار آئے تھے، لیکن مولانا نے کسی کو اجازت نہ دی، مولانا ہی کی دعا پر اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

دوران قیام کئی اہل محبت نے اپنے یہاں لے جانے کی کوشش کی، لیکن کہیں جانے کو آمادہ نہ ہوئے، دن رات مدرسہ ہی میں قیام رہا، صرف کھانے کے وقت میرے گھر تشریف لے جاتے اور والد ماجد کے ہمراہ کھانا تناول فرماتے، یہ ۱۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۴/ مئی ۲۰۰۸ء کی بات ہے، اس وقت تک وہ اپنے شیخ طریق حضرت مولانا عبدالواحد صاحبؒ سے اجازت یافتہ ہو چکے تھے، لیکن والد صاحب کے ساتھ وہی تواضع و مسکنت جو کبھی ان آنکھوں نے پہلے پہل دیکھی تھی۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں سے عقیدت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

مدرسہ کے معائنہ رجسٹر پر ان دونوں بزرگوں کی روشن تحریریں آج بھی ثبت ہیں، جو آئندہ بھی ہمیں روشنی دیتی رہیں گی ان شاء اللہ:

قاری شبیر صاحب مدظلہٗ نے حوصلہ افزائی کے کلمات لکھے، ایک سطر آپ بھی پڑھئے:

"پچھلے چند برسوں میں اس مدرسہ نے تعلیمی وانتظامی لحاظ سے ترقی کی جو منزلیں طے کی ہیں، وہ لائق ستائش اور قابل تعریف ہے، توقع ہے کہ مستقبل میں علم کا یہ جوئے رواں بحر ذخار بن کر گلشن اسلام کی شادابی وسیرابی کا زبردست ذریعہ بن سکے گا،"

اس پر مولانا اعجاز احمد اعظمی نے اپنی ان دعاؤں کے ساتھ دستخط ثبت فرمائے:

"اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ کہ اس ادارہ کو دین اور دینی تعلیم وتربیت کا مرکز بنائیں، اس پورے علاقہ میں اس کی وجہ سے علم وعرفان کی روشنی پھیلے اور کردار وعمل کی پختگی عام ہو، اخلاص وللّٰہیت کا سرمایہ حاصل ہو اور طریقۂ شریعت وسنت پر علم وعمل کا کارواں رواں دواں رہے، اور اللہ تعالیٰ اسے حسن قبول سے نوازیں، آمین یارب العالمین بمرتبۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد"(اعجاز احمد اعظمی)[25]

[25] - تحریر بہ مقام جامعہ بانی منور واشریف، بتاریخ ۷ / ربیع الاول ۱۴۳۵ھ م ۸ / جنوری ۲۰۱۴ء

گنجینۂ علوم ہے یہ گنج زر نہیں

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کا علمی مقام

حضرت الاستاذ مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ (م ۲۰۱۳ء) اپنے وقت کے عظیم عالم دین، بلند پایہ محقق، بے مثال مدرس، اور بے نظیر معلم و مربی تھے، وہ علم کی روح اور اشیاء کے حقائق تک رسائی رکھتے تھے، نگاہ ایسی دقیقہ رس پائی تھی کہ سوال خواہ کسی لب ولہجہ میں کیا جائے، اور الفاظ و تعبیرات کا کیسا ہی جامہ اسے پہنا دیا جائے مگر وہ ان کے پیچھے چھپے ہوئے محرکات کو دیکھ لیتے تھے، ان کو فریب دے کر گذرنا آسان نہیں تھا، اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

علمی امتیاز

علم اتنا وسیع کہ کوئی شعبۂ علم ان کے دائرۂ نگاہ سے باہر معلوم نہیں ہوتا تھا، اور مطالعہ اتنا تیز کہ اس کی نظیر میں نے نہیں دیکھی (ان کے مطالعہ کا حال میں نے اپنے احوال مطالعہ کے ضمن میں لکھا ہے) وہ شاخوں پر نہیں جڑوں پر نظر رکھتے تھے، وہ حال سے زیادہ مآل پر اور فروع وجزئیات سے زیادہ اصول ولمیات کو ہدف بناتے تھے، خاص طور پر عقائد و نظریات اور اسلامی افکار پر وہ محققانہ مطالعہ رکھتے تھے، فقہ وحدیث اور تصوف ان کی دلچسپی کے موضوعات تھے، جدل ومناظرہ سے ان کی طبیعت میں نفور تھا لیکن ضرورت پڑنے پر وہ مرد میدان نظر آتے تھے، بلکہ آپ کے محفوظ تحریری سرمایہ کا بڑا حصہ اسی نوع کے جوابات اور غیر متوازن نظریات کی تردید و تنقید پر مشتمل ہے، ان کے علم کا اندازہ ان کی مجلسوں میں ہوتا تھا، وہ خود سے بولنے اور لکھنے کے زیادہ قائل نہ تھے، لیکن کوئی سوال کر دیتا تو ان کا

جوہر علم کھل کر سامنے آتا تھا، فکر اور ذہن انتار ساتھا کہ سوال ختم ہونے سے پہلے اس کے تمام جوانب ان پر روشن ہو جاتے تھے، سوال جتنا مشکل ہوتا اتنا ہی زیادہ وہ شاندار جواب دیتے تھے، اور میں نے بارہا تجربہ کیا کہ جواب میں بہت سے ایسے علوم و معارف بیان فرماتے جو کتابوں اور ہم جیسے لوگوں کے حدود مطالعہ سے بالاتر ہوتے، مسلسل تجربہ کی روشنی میں میرا یقین ہے کہ وہ کئی علوم میں اجتہادی شان رکھتے تھے۔

میں حضرت مولانا کے ان شاگردوں میں ہوں جنہوں نے سب سے زیادہ آپ سے سوالات کئے ہیں اور آپ کے قیمتی اوقات ضائع کئے ہیں، میں ان سے سوالات مآخذ تک رسائی کے لئے نہیں بلکہ حقیقت علم تک رسائی کے لئے کرتا تھا، اسی لئے کئی بار مآخذ کا مجھے پتہ ہوتا تھا، اور بعض سوالات کے جوابات بھی میرے ذہن میں ہوتے تھے، جو میں ان کے سامنے پیش کر دیتا تھا، لیکن اصلاً مجھے حقیقت علم کی تلاش ہوتی، اور اسی کے لئے میں ان سے رجوع کرتا تھا، میں نے اندازہ کیا کہ جو شخص جتنی تیاری کر کے آپ سے علمی مراجعت کرتا، وہ اتنا ہی زیادہ آپ سے مستفید ہو سکتا تھا، اور اسی قدر آپ کی عظمت علمی کا اندازہ ہوتا تھا، وہ علم کا ایسا بحر بے کراں تھے، کہ ماہر سے ماہر غواص بھی اس کی تہ تک پہونچنے میں دشواری محسوس کرتے تھے۔

افسوس مولانا کی وفات سے علم کا ایک باب عظیم بند ہو گیا، مزید افسوس اس پر کہ ان کا علم سینہ سے سفینہ میں منتقل نہ ہو سکا، آج ان کا جو کچھ علمی سرمایہ صفحات قرطاس پر محفوظ ہے، وہ ان کے علم کا بہت تھوڑا حصہ ہے، یہ ان کی علمی جلالت شان کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہے، کاش وہ شروع ہی سے لکھنے پر توجہ دیتے اور صرف سوال یا طلب کی صورت کا اپنے کو پابند نہ کرتے تو امید تھی کہ علم کی ایک بڑی لائبریری وجود میں آجاتی، ان کا علم منقول بھی تھا اور موہوب بھی، اس طرح علم کا وہ گنج گرانمایہ ہمیں حاصل ہوتا جس کا اب ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

مولانا کا موجودہ علمی سرمایہ ان کے علم کا بہت تھوڑا حصہ

موجودہ مطبوعہ سرمایہ صرف چند علمی سوالات یا خطوط کے جوابات ہیں، جو انہوں نے حسب

موقعہ قلم برداشتہ تحریر فرمادیئے تھے، اورزیادہ تر ایک مجلس میں لکھی گئی تحریریں ہیں، جس میں نہ حوالوں کی تلاش کی مہلت ہوتی تھی، اور نہ مکمل ذہنی واردات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کا موقعہ ہوتا تھا، بس محدود وقت میں جتنا لکھ دیا لکھ دیا، پھر اگلی فرصت میں کوئی اور چیز اشہب قلم کا موضوع بنتی تھی، اکادکا ہی موضوعات ہیں جن پر آپ نے مکرر سہ کرر قلم اٹھایا ہے، اپنی عادت قلمی کے بارے میں اس حقیر کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"کئی روز سے سوچ رہا تھا کہ بقیہ بھی لکھ کر چھٹی کروں، مگر فرصت تحریر عنقا ہے، اور مسئلہ دقیق بھی ہے اور طویل بھی، متعدد مجالس میں لکھنے کی عادت نہیں اور طویل مجلس ملتی نہیں، اس لئے دیر ہوتی جارہی ہے، آج بنام خدا قلم اٹھاتا ہوں، حق تعالیٰ شانہ بخیر وخوبی پورا کرنے کی توفیق دیں[26]۔

اسی طرح ایک سائل کو تنبیہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"اس کا خیال رکھو کہ ایک خط میں ایک ہی سوال لکھا کرو، تاکہ تفصیل سے اس کا جواب قلمبند ہوسکے، میں لکھتے لکھتے اکتا جاتا ہوں، ایک ہوگا تو سیر حاصل بحث ہوسکے گی، تمہارا ہر سوال مستقل ایک مقالہ چاہتا ہے، اور جی بھی یہی چاہتا ہے، اس طرح ایک علم مدون ہو جائے گا، لیکن کئی سوال ہونے کی وجہ سے سب کو سمیٹنا پڑا، اب اگلے خط میں ایک ہی بات لکھو، ان شاء اللہ اس کا مفصل جواب تحریر کروں گا"[27]

اور اکثر طویل تحریروں کے اختتام پر اس قسم کے جملے لکھتے تھے کہ:

"بس بھائی! بات ابھی باقی ہے، مگر تھک بھی گیا ہوں اور وقت بھی ختم ہو گیا ہے،

---

26 - حدیث دوستاں ص ۵٦٦ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ، فروری ۲۰۱۰ء (خط بنام اختر امام عادل قاسمی)

27 - حدیث دوستاں ص ٦۰۸ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ، فروری ۲۰۱۰ء، (خط بنام مفتی نسیم احمد قاسمیؒ)

اس وقت اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں[28]

"اتنا لکھنے کے بعد طبیعت بالکل منغض و مکدر ہو گئی، اب قلم رکھتا ہوں اور یہ سلسلہ بند کرتا ہوں"[29]

"سوچا تھا کہ کچھ اور لکھوں گا، مگر فرصت نہیں ہے، اس لئے بعد میں لکھوں گا"[30]

ایک جگہ تحریر فرمایا:

"میں ایک نرا مدرس ہوں، لکھنا میرا شوق نہیں، محض ضرورت پر مجبوراً لکھتا ہوں، اور جو کچھ لکھتا ہوں اس کی حفاظت سے بے پرواہ ہوتا ہوں، میرا لکھا ہوا سب گم ہو چکا ہوتا، لیکن جب سے اس عزیز (مولانا ضیاء الحق خیر آبادی المعروف بہ حاجی بابو) کا ساتھ ہوا ہے، انہوں نے میرا حرف حرف سنبھالنے کی کوشش کی"[31]

ان حالات میں ظاہر ہے کہ جو کچھ محفوظ رہ گیا وہ بسا غنیمت ہے، اور اس کے لئے میں مولانا ضیاء الحق خیر آبادی صاحب کو تہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں، اور ان کا ممنون کرم ہوں کہ انہوں نے حضرت مولانا کے علوم و معارف کے تحفظ کے لئے قابل قدر خدمات انجام دیں، حضرت مولاناؒ کے پورے حلقہ کو ان کا احسان مند ہونا چاہئے کہ انہوں نے سب کی طرف سے تنہا اس فرض کفایہ کو انجام دیا، اللہ پاک ان کو جزائے خیر سے نوازے، اور ان کے علم و صحت میں برکت عطا فرمائے آمین۔

---

28 – حدیث دوستاں ص ۵۶۶ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ، فروری ۲۰۱۰ء، (خط بنام اختر امام عادل قاسمی)

29 – حدیث دوستاں ص ۵۸۳ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ، فروری ۲۰۱۰ء، (خط بنام اختر امام عادل قاسمی)

30 – حدیث دوستاں ص ۶۰۸ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ، فروری ۲۰۱۰ء، (خط بنام مفتی نسیم احمد قاسمیؒ)

31 – حدیث دوستاں ص ۳۷۲ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ، فروری ۲۰۱۰ء (تعارفی تحریر برائے مولانا ضیاء الحق خیر آبادی)

حضرت مولاناؒ کے موجودہ علمی سرمایہ کو آپ کے وسیع و عمیق علم کے مقابلے میں کوئی نسبت نہیں ہے، اس لئے اس کو آپ کی عظمت علمی کے ناپنے کا معیار نہ سمجھا جائے، اور یہ بات وہی لوگ جان سکتے ہیں، جنہوں نے مولانا کے علم اور مطالعہ کو قریب سے دیکھا ہو، مولانا رواں ذہن اور سیال قلم کے مالک تھے، طبیعت میں جوش ہوتا تو ایک ایک موضوع پر علم کا دریا بہادیتے تھے، اس کا اندازہ آپ کے خطوط سے ہوتا ہے، کہ بظاہر خط کا مخاطب فرد واحد ہوتا تھا، اور اکثر جو ما حضر ہوتا وہی زیب قرطاس ہوتا تھا، الگ سے باقاعدہ اس کے لئے تیاری نہیں کی جاتی تھی، اور نہ اس کے نوک و پلک درست کرنے کا اہتمام کیا جاتا تھا، لیکن اس کے باوجود مولانا نے جس طرح اپنے خطوط میں مختلف علمی موضوعات پر محققانہ گفتگو کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اگر وہ ان مسائل پر مستقل مقالہ یا کتاب لکھنے کا ارادہ کرتے تو کیسے کیسے ضخیم مجلات تیار ہو جاتے۔۔۔۔ بہر حال آج جو کچھ مولانا کی چیزیں ہمارے پاس موجود ہیں، وہ بھی بسا غنیمت ہیں، اسی کچھ سے مولانا کے کل کا کسی درجہ میں قیاس کیا جاسکتا ہے۔

مولانا کے یہاں موضوعات کا تنوع ملتا ہے، کئی علمی اور فکری مسائل پر آپ کی شاہکار تحریریں موجود ہیں، ان میں قرآن، حدیث، فقہ اسلامی، تصوف و اخلاق، کلام و عقائد اور منطق و فلسفہ وغیرہ ہر طرح کے موضوعات شامل ہیں، آپ کے علمی مضامین کا بڑا مخزن آپ کا مجموعۂ مکاتیب " حدیث دوستاں " اور مجموعۂ مقالات "علوم و نکات" ہیں، یہ دونوں علمی و فکری لحاظ سے حضرت مولانا کی اہم کتابیں ہیں، بطور نمونہ یہاں چند موضوعات پر آپ کے کچھ علمی تراشے پیش کئے جاتے ہیں، جن سے آپ کے فکر و مطالعہ کی وسعت اور بے پناہ عبقری صلاحیت و جامعیت کا اندازہ ہو گا:

(۱)

قرآنی بصیرت و خدمات

☆ قرآن کریم سے مولانا کو بے پناہ شغف تھا، اور اس کے دقائق و معانی پر گہری نگاہ تھی، مجھے آپ سے مدرسہ دینیہ غازی پور کے نصاب کے مطابق عربی پنجم میں تفسیر جلالین پڑھنے کا شرف

حاصل ہوا ہے، بلکہ جلالین آپ نے مجھے تحفہ میں عنایت فرمائی تھی، آپ بہت محنت اور ذوق کے ساتھ جلالین کا درس دیتے تھے، یہ آپ کی پسندیدہ کتابوں میں سے ایک تھی، اس کتاب کے درس سے قرآن کے ساتھ آپ کے عشق اور فہم و تدبر کا اندازہ ہوتا تھا، بعد کے دور میں آپ نے جلالین کی اردو شرح "تسہیل الجلالین" کے نام سے لکھی، جو ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی، یہ کتاب آپ کی قرآن فہمی کا بہترین نمونہ ہے، اس میں ترجمہ و تشریح کے ساتھ مضامین آیات و تفسیر کے بیان کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، اس لحاظ سے یہ شرح جلالین بھی ہے اور مستقل تفسیر قرآن بھی، مگر افسوس اس کی تکمیل نہ ہو سکی اور صرف ایک جلد (سورہ بقرہ تا سورہ نساء) شائع ہوئی، اگر یہ کتاب مکمل ہو جاتی تو اپنے طرز بیان اور جامعیت کے لحاظ سے ایک منفرد چیز ہوتی۔

☆ ہمارے وقت میں آپ غازی پور کی ایک مسجد میں قرآن کریم کا ہفتہ واری درس بھی دیتے تھے، جس میں شہر کے لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے، درس قرآن کا یہ سلسلہ قیام شیخوپور کے زمانہ میں بھی جاری تھا، اور اعظم گڑھ کی ایک جامع مسجد میں آپ کا درس قرآن ہوتا تھا، جس میں ایک بار مجھے بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

قرآن کریم سے آپ کے مسلسل اشتغال کا نتیجہ تھا، کہ قرآن کریم کے معانی و مفاہیم کے لئے آپ کا سینہ کھل گیا تھا، اور بہت سے اہم مسائل کا استنتاج آپ قرآن کریم سے کرتے تھے، اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ:

مسئلۂ تقدیر پر آیت قرآنی سے استدلال

کسی نے آپ سے تقدیر مبرم و معلق سے متعلق سوال کیا، اور اس تناظر میں انسان کے جبر و اختیار کی حقیقت کو سمجھنا چاہا، جو زمانۂ قدیم میں بھی کافی نزاعی مسئلہ رہا ہے، تو آپ نے قرآن کریم کی چند آیات کو پیش نظر رکھ کر اس مسئلہ پر ایسی شاندار، مرتب اور دلنشیں تقریر فرمائی، جو اس موضوع کے تمام شبہات کو دور کرنے کے لئے کافی ہے، آپ نے تقدیر کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا (چند اقتباسات):

"یہ مسئلہ خلاف عقل نہیں ہے ،ہاں احاطۂ عقل سے خارج ہے۔۔۔تمام مذاہب اور تمام حکماء معتبرین کا اس پر اتفاق ہے کہ خدا تعالیٰ تمام صفات کمال کا جامع ہے، اور ظاہر ہے کہ صفات کمال میں سے اکمل ترین صفت علم ہے،لامحالہ اس کا علم ازل وابد اور کلی وجزئی سب کو محیط ہو گا،۔۔۔اسی علم کی تحریر کا نام تقدیر ہے۔

دوسرا مسلمہ مسئلہ یہ ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ نے تھوڑا سا ہی سہی اختیار عنایت فرما رکھا ہے ، اس کو ہر شخص بطور بداہت کے جانتا ہے، یہی اختیار سزا وجزا کی بنیاد ہے،اور یہ بنیاد بالکل صحیح اور موافق عقل ہے۔

تیسرا مسلمہ مسئلہ یہ ہے کہ ظلم کہتے ہیں یا تو ملکیت غیر میں تصرف کرنے کو یا اپنی ملکیت میں نامناسب عمل کرنے کو، حق تعالیٰ کے لحاظ سے ملکیت غیر کا تو تصور ہی نہیں ۔۔۔۔انسان کا اختیار محسوس ہے اور جبر نامعلوم اور غیر محسوس ہے،جبر کہتے ہیں سلب اختیار کو،اس کا اثبات ایک غلط مقدمہ پر مبنی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کی مقادیر پہلے متعین کر چکے ہیں ،اوران کی مخلوق میں سے انسان بھی ہے،اس کی بھی تقدیر اللہ نے پہلے ہی متعین کر دی ہے،تو انسان مجبور محض باقی رہا " سوال یہ ہے کہ تعیین تقدیر کی وجہ سے مجبور محض کیوں کر ہو جائے گا؟ کیا تعیین تقدیر میں اعطاء اختیار داخل نہیں ہے۔۔۔تو سلب اختیار کدھر سے آیا، اس سے تو واضح طور پر اختیار ہونا معلوم ہوتا ہے،ہاں اعطاء اختیار میں وہ مختار نہیں ہے،اسی لئے کہتا ہوں کہ اختیار معلوم ہے اور جبر نامعلوم ۔فرض کرو اگر تعیین تقدیر کے باعث جبر آتا ہے تو بتاؤ کہ وہ مقادیر انسان کو معلوم ہیں ؟ ہر گز نہیں پھر اس کے نتیجے میں جو جبر آئے گا، وہ کیوں کر معلوم ہو جائے گا،اگر تم یہ کہو کہ اجمالاً مقادیر کا وجود تو معلوم ہے لہٰذا جبر بھی معلوم ہو گا،اتنا تو ہم بھی کہتے

ہیں کہ لیکن جبر جو اجمالاً ثابت ہو گا، اس سے کوئی محذور لازم نہ آئے گا، جب کہ اختیار تفصیلی معلوم ہے اور سزا و جزا محض اختیار ہی کے بقدر ہو گا، اس سے زیادہ نہ ہو گا، اس لئے کوئی اشکال نہیں ہے[32]۔

پھر آپ نے درج ذیل آیات کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کہ:

يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ (39) وَإِنْ مَا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (40) أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (41) وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّارُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ(42)[33]

"غور کرو تقدیر مبرم و معلق کا سراغ اس میں مل جائے گا"[34]۔

قرآن وحدیث میں "فطرت" سے مراد

☆اسی طرح قرآن کریم میں "فطرۃ" کا لفظ آیا ہے:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ[35]

حدیث پاک میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال:قال النبي صلى الله عليه و سلم (

---

[32] - حدیث دوستاں ص۵۸۵ تا۵۸۸ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ، فروری ۲۰۱۰ء (خط بنام مولانا احمد سعید قاسمیؒ)

[33] -الرعد :۳۹ تا۴۲

[34] - حدیث دوستاں ص۵۸۸ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ، فروری ۲۰۱۰ء، (خط بنام مولانا احمد سعید قاسمیؒ)

[35] -الروم -۳۰

كل مولود يولدعلى الفطرة فأبواه يهودانه أوينصراه أويمجسانه كمثل البهيمة تنتج البهيمة هل ترى فيها جدعاء[36]

اس سے مراد اسلام ہے یا استعداد اسلام ؟مفسرین اور محدثین میں دونوں طرح کی آراء پائی جاتی ہیں، لیکن حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ نے قول عدل استعداد اسلام کو قرار دیا، اور اسلام کے قول کو بھی اسی پر محمول فرمایا، اس لئے کہ عین اسلام مراد لینے کی صورت میں بہت سے اشکالات وارد ہوتے ہیں، مثلاً:

"(۱)اگر یہ صحیح ہے کہ ہر بچہ خلقتاً مسلمان ہوتا ہے تو سمجھ آنے کے وقت اس کو مسلمان قرار دینا چاہئے، فرض کرو کوئی اسلامی حکومت ہو تو اس کی غیر مسلم رعایا کے بچوں کو مسلمان مان کر مسائل کو اسی بنیاد پر متفرع کرنا چاہئے، مثال کے طور پر یہ بچہ نا سمجھی کے زمانے میں مر جائے تو اس کا ترکہ اس کے والدین کو یا اس کے برعکس صورت میں والدین کا ترکہ اس کو نہیں ملنا چاہئے، کیونکہ اختلاف دین کی صورت میں توارث جاری کرنا ممکن نہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بعض علماء نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ اس حدیث کا تعلق حکم دنیوی سے نہیں ہے، حکم اخروی سے ہے، لیکن اس تخصیص کی دلیل کیا ہے؟

(۲)اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس کا تعلق محض حکم آخرت سے ہے، تو بالفرض اگر کافر کا بچہ مر جائے، تو اسے قطعیت کے ساتھ جنتی کہنا چاہئے:

حالانکہ حدیث میں ہے:

عن ابن عباس رضي الله عنهم قال سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن أولاد المشركين فقال الله إذ خلقهم أعلم بما كانوا عاملين[37]

---

[36] - الجامع الصحيح ج 1ص 465 حديث نمبر :1319 المؤلف : محمد بن إسماعيل أبو عبدالله البخاري الجعفي الناشر : دار ابن كثير ، اليمامة – بيروت الطبعة الثالثة ، 1407 – 1987تحقيق : د. مصطفى ديب البغا أستاذ الحديث وعلومه في كلية الشريعة – جامعة دمشق عدد الأجزاء : 6مع الكتاب : تعليق د. مصطفى

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قطعیت کے ساتھ ان کے جنتی ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

(۳) حدیث خضر میں بچہ کا کافر مطبوع ہونا مصرح ہے۔

(۴) حق تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں فرمایا ہے کہ لاتبدیل لخلق اللہ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس حالت پر خدا نے پیدا کر دیا ہے، اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، حالانکہ حدیث میں صراحتاً تبدیلی کا ذکر موجود ہے، اور مشاہد بھی یہی ہے ،ہاں اگر اس کو نہی قرار دیا جائے، تو معنیٰ درست ہو سکتا ہے، لیکن یہ تکلف ہے۔

(۵) اگر اسلام پیدائشی اور جبلی امر ہے، تو ظاہر ہے کہ بندے کے اختیار سے نہیں ہے، اس کے ارادہ واختیار کے بغیر اسلام اس کی سرشت میں داخل کر دیا گیا ہے، اور یہ بدیہی ہے کہ سزا و جزا کا مدار اختیار پر ہے، پھر چاہئے کہ اسلام پر اس کو کوئی اجر و ثواب نہ ہو۔

یہ اشکالات ہیں جن کی بنا پر فطرۃ سے عین دین اسلام مراد لینا ایک مشکل مسئلہ ہے، علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے فیض الباری میں اس موضوع پر نفیس بحث کی ہے [38]۔

حاصل یہ ہے کہ فطرۃ عین اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام کی وہ استعداد ہے جو ابتداء آفرینش ہی سے انسان کی نہاد میں رکھ دی گئی ہے، اگر خارجی اسباب و عوامل نہ ہوں اور انسان اپنی خلقت پر قائم رہ جائے تو اپنے اختیار سے وہ اسلام ہی کو پسند کرے گا"۔

---

[37] -- الجامع الصحيح ج 1ص 465 حديث نمبر :1317 المؤلف : محمد بن إسماعيل أبو عبدالله البخاري الجعفي الناشر : دار ابن كثير ، اليمامة – بيروت الطبعة الثالثة ، 1407 – 1987تحقيق : د. مصطفى ديب البغا أستاذ الحديث وعلومه في كلية الشريعة – جامعة دمشق عدد الأجزاء : 6مع الكتاب : تعليق د. مصطفى

[38] -فیض الباری ج ۲ ص ۳۸۵

رہی یہ بات کہ آیت کریمہ میں فطرت کو دین قیم کہا گیا ہے، دین قیم تو اسلام ہی ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنی اصطلاح میں دین قیم کا اطلاق اسلام کے لئے متعین نہیں ہے، بلکہ تکوینیات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، قرآن کریم میں ہے

"إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ[39]

ظاہر ہے کہ سال کا بارہ مہینوں پر مشتمل ہونا از قبیل تکوینیات ہے، احکام شرع میں اس کا شمار نہیں ہے، لیکن اسے بھی حق تعالیٰ نے دین قیم فرمایا ہے، فطرۃ اور استعداد بھی تکوینی امور میں سے ہے، اس پر دین قیم کا اطلاق اسی لحاظ سے ہے---

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک اور آیت پر غور کرو، حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَاوحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا[40]

اس آیت میں امانت سے مراد کیا ہے؟ کیا اسلام ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں، ورنہ لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ والی بات بے ربط ہو کر رہ جائے گی، کیونکہ اس امانت کو تو تمام انسانوں نے قبول کیا ہے، ہر انسان اس امانت کو لے کر پیدا ہوتا ہے، اور محض بے اختیاری امر ہے، تکویناً اس کا بار اٹھا لینے کے بعد کوئی اس کو خود سے پھینکنا چاہے تو ممکن نہیں ہے، ناچار یہی کہنا پڑے گا کہ اس سے وہی استعداد مراد ہے، جس کی تعبیر دوسری آیت میں فطرۃ اللہ سے کی گئی ہے[41]۔

---

[39] -التوبة :٣٦

[40] -الاحزاب :٧٢

حضرت مولانا نے اس سلسلے میں حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی تحقیقات سے استفادہ کیا ہے۔

تقدیر کی مذکورہ بالا تشریح سے مولانا کی قرآنی فکر اور بصیرت پر روشنی پڑتی ہے۔

(۲)

علم حدیث اور خدمات جلیلہ

علم حدیث بھی آپ کا خاص موضوع تھا، اس موضوع پر آپ کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، مثلاً:

فتنۂ انکار حدیث کا تعاقب

☆ فتنۂ انکار حدیث کے خلاف آپ نے کئی اہم مضامین اور خطوط تحریر فرمائے، جن میں مبارک پور کے منکر حدیث جناب عبد الخالق صاحب کا علمی تعاقب خاص طور پر قابل ذکر ہے، حدیث دوستاں میں ان کے نام کئی تفصیلی خطوط موجود ہیں جن میں اس فتنہ کی سرکوبی کا آپ نے حق ادا کیا ہے، اور اس سلسلہ میں اٹھائے جانے والے تمام سوالات کا مدلل علمی، عقلی اور تاریخی جائزہ لیا ہے[42]۔

☆ اس ضمن میں آپ کی وہ تحریر بھی حد درجہ بصیرت افروز اور چشم کشا ہے جو آپ نے مجلہ فیوچر اسلام کے ایڈیٹر محمد راشد شاذ صاحب کے خط کے جواب میں لکھی، جدید نسل کے تحفظ و تشکیل پر یہ ایک بہترین تحریر ہے، اور اس سے مولانا کی بالغ نظری اور زمانہ شناشی کا بھی خوب اندازہ ہوتا ہے[43]۔

---

41 - حدیث دوستاں ص ۶۱۷ تا ۶۲۴ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ، فروری ۲۰۱۰ء (خط بنام مفتی نسیم احمد قاسمیؒ)

42 - دیکھئے حدیث دوستاں ص ۶۴۶ تا ۶۷۴ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر مکتبہ ضیاء

43 - دیکھئے حدیث دوستاں ص ۷۰۶ تا ۷۱۸ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر مکتبہ ضیاء

کتب احادیث کا تعارف

☆ان کے علاوہ بعض کتب احادیث پر آپ نے جو تعارفی مضامین لکھے ہیں ،وہ بھی فن حدیث کی بڑی خدمت ہے، آپ نے حضرت محدث اعظمی مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ کی تحقیق و تعلیق سے شائع شدہ کئی کتابوں کا تفصیلی تعارف "مجلہ المآثر مئو"میں تحریر فرمایا،مثلاً،مسند حمیدی (تالیف امام ابو بکر عبداللہ بن زبیر قرشی اسدی حمیدی مکیؒ)،کتاب الزہدوالرقائق (تالیف حضرت عبداللہ بن مبارکؒ)،المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیۃ (تالیف حافظ ابن حجرؒ)،کشف الاستار عن زوائد البزار(تالیف حافظ نورالدین ہیثمیؒ)،مؤطاامام محمدؒ،استدراکات علمیہ (تالیف حضرت محدث اعظمیؒ)اورالبانی شذوذہ واخطاءہ(تالیف حضرت محدث اعظمیؒ)ہر ایک پر آپ نے مستقل مضامین لکھے۔

ضعیف اور موضوع احادیث کے متعلق محدثین کی اصطلاحات

☆اسی طرح ضعیف اور موضوع احادیث کے متعلق حضرات محدثین کی اصطلاحات پر آپ کا ایک بصیرت افروز مقالہ ہے،جو حضرت ملا علی قاریؒ کی کتاب "المصنوع فی معرفۃ الحدیث الموضوع "پر شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کے مقدمہ کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا تھا۔

حضرت امام محمدؒ پر محدثین کے الزامات کا علمی جائزہ

☆شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کا ایک مقدمہ التعلیق الممجد علی الموطأ امام محمد" پر ہے ،جس میں حضرت امام محمدؒ پر محدثین کے الزامات کا علمی جائزہ لیا گیا ہے،اور رائے اور قیاس کی معنویت اور حدود پر روشنی ڈالی گئی ہے،مولانا نے یہ پوری بحث اردو میں منتقل فرمائی،اور وہ مضمون کی شکل میں "امام محمد اور اہل الرائے ہونے کی حقیقت وحیثیت" کے نام سے شائع ہوا۔

کتابت حدیث کے اصول و قواعد

کتابت حدیث کے اصول و قواعد پر بھی آپ کا ایک گرانقدر مضمون ہے جو مقدمہ ابن

الصلاح کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے، فن حدیث پر یہ بہت قیمتی چیز ہے[44]۔

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں علم حدیث سے حضرت مولاناؒ کی خصوصی مناسبت اور خدمات جلیلہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۳)

مولانا کا تفقہ اور خدمات فقہیہ

تدریس فقہ کا طریقۂ نایاب

☆ فقہ اور اصول فقہ سے بھی حضرت مولانا کو خاص لگاؤ تھا، ساری زندگی کتب فقہ واصول فقہ کی تدریس اور مسائل واصول کی تفہیم و تطبیق میں گذری، آپ کو اس فن میں کیسا عبور تھا، اس کا صحیح اندازہ آپ کے دروس میں ہوتا تھا، میں نے فقہ اور اصول فقہ کی زیادہ تر کتابیں (متوسطات) مولانا ہی سے پڑھیں، اصول فقہ میں اصول الشاشی، نورالانوار اور حسامی، اور فقہ میں قدوری، شرح وقایہ، اور ہدایہ اولین آپ کے زیر درس رہیں، اصول فقہ پر آپ کی تقریر ایسی عالمانہ اور بصیرت افروز ہوتی تھی کہ اس سے بہتر کا تصور ممکن نہیں، اسی طرح فقہی مسائل کی ایسی دل نشین تشریح فرماتے کہ کوئی شبہ باقی نہ رہتا تھا، غازی پور میں میری طالب علمی کے زمانے میں آپ کے فقہی اشتغال سے متأثر ہو کر ہمارا احساس تھا کہ آپ اصلاً فقہ کے آدمی ہیں، منطق وفلسفہ سے بظاہر بعد ظاہر فرماتے تھے، اور معقولات کی کتابوں کی تدریس میں وہ جوش نظر نہ آتا تھا جو فقہی کتابوں کی تدریس میں ہم محسوس کرتے تھے، وہ تو دیوبند جانے کے بعد جب مجھے بعض کلامی مسائل میں الجھن پیدا ہوئی اور میں نے مولانا سے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ منطق وفلسفہ میں بھی آپ کو بے نظیر درک حاصل تھا، اور ان کی تفہیم و تحلیل کا بھی آپ کو بے پناہ ملکہ تھا۔

بہر حال فقہ اور اصول فقہ میں حضرت مولانا ہمارے لئے بہترین اسوہ تھے، میں نے فقہ و

---

44 -واضح رہے کہ یہ تمام مضامین آپ کے مجموعۂ مقالات "علوم ونکات" جلد اول میں محفوظ ہیں۔

اصول فقہ میں حضرت مولانا کے طریق تدریس کی پیروی کی، اور میں آج بھی اسی احساس کے ساتھ زندہ ہوں کہ تدریس فقہ کا جو شاندار طریقہ مجھے مولانا سے حاصل ہوا وہ کہیں نہیں ملا، اور مجھے فخر ہے کہ میں مولانا کی تدریسی اقدار کا نقال اور علمبر دار ہوں۔

فقہی مقام

فقہیات میں جس درک اور بصیرت کے آپ حامل تھے، آپ کا تحریری سرمایہ اس کے مقابلے میں حد درجہ مختصر ہے، اگر کوئی چاہے کہ آپ کے مطبوعہ فقہی مضامین کی بدولت آپ کے فقہی مقام کا تعین کرلے تو اس کو سخت مایوسی ہوگی، آپ نے فقہی تحقیقات کو اپنا قلمی موضوع نہیں بنایا، اور نہ اپنے فقہی مطالعات کو قلمبند کرنے کا اہتمام کیا، حالانکہ کئی چیزیں ایسی تھیں کہ اگر آپ ان پر کام کرتے تو اس عصر میں آپ سے بہتر کام کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

ایک جدید ترین مجموعۂ قوانین اسلامی کی تجویز- جو شرمندۂ تعمیل نہ ہو سکی

مثال کے طور پر ایک بار آپ نے ہدایہ کی شرح لکھنے کا ارادہ کیا، اتفاقاً حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی دامت برکاتہم محدث دارالعلوم دیوبند سے ملاقات پر آپ نے اپنے اس عزم کا اظہار فرمایا تو حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب نے فرمایا کہ ہدایہ کی کئی شرحیں آچکی ہے، اب اس کی مروجہ شرح لکھنے کی کوئی خاص افادیت نہیں ہے، اگر آپ کو کام ہی کرنا ہے تو حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی کتاب "اسلامی عدالت" شائع ہوئی ہے جو اسلام کے عدالتی نظام سے متعلق ہے، اور موجودہ عدالتوں کے مروجہ معیار کے مطابق دفعات کی ترتیب پر ہے، آپ ہدایہ کے مسائل کو اسی انداز میں دفعہ وار مرتب کریں، اور اس میں دیگر کتابوں کے مسائل بھی شامل کریں، اور صرف مفتٰی بہ اور معمول بہ مسائل کا انتخاب کریں، تو موجودہ زمانہ کے عرف کے مطابق اسلامی قوانین کا ایک جدید ترین مجموعہ تیار ہو سکتا ہے، اور دفعات کے لحاظ سے مسائل کا حوالہ دینا آسان ہو جائے گا، اس لئے کہ موجودہ زمانے میں صلاحیتیں اس کی متحمل نہیں ہیں کہ موضوعات کے لحاظ سے ہزاروں صفحات میں پھیلے ہوئے فقہی ذخیرہ سے کوئی عام پڑھا لکھا آدمی (بلکہ بہت سے علماء بھی) کوئی مسئلہ نکال سکیں، اس دور میں اسلامی قانون

کے لئے ایک جدید ترین ریفرینس بک کی ضرورت ہے، جو آپ جیسے ذہین علماء ہی انجام دے سکتے ہیں، جو صاحب علم بھی ہیں اور صاحب زبان بھی۔

یہ بات حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحبؒ نے خود ہی بیان فرمائی، پتہ نہیں اس قصہ کا ذکر آپ کے کسی تذکرہ میں آیا ہے یا نہیں، واضح رہے کہ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا مجموعۂ قوانین اسلامی شائع نہیں ہوا تھا (علاوہ یہ مجموعہ صرف پرسنل لاء سے متعلق ہے، پورے اسلامی قانون پر حاوی نہیں ہے)

اس کے بعد آپ نے ہدایہ کی شرح تو نہیں لکھی، لیکن مذکورہ بالا مجوزہ کام کے لئے بھی خود کو فارغ نہ کر سکے، اگر یہ عظیم کام آپ کے ذریعہ یا کم از کم آپ کی نگرانی میں انجام پاتا تو ایک عظیم فقہی کارنامہ انجام پاتا، اور اس کام کے لئے آپ سے زیادہ موزوں شخص کوئی نہیں تھا، جس کو فقہ، حدیث، حکمت واخلاق اور زبان و قلم سب پر قدرت حاصل ہو، اور اس کی علمی، عملی اور فکری قوتیں بھی تر و تازہ ہوں، لٰکن اللہ قدر ماشاء۔

مولانا کی فقہی تحریرات پر ایک نظر

آپ کے مجموعۂ مقالات "علوم و نکات" میں کل گیارہ (۱۱) فقہی مضامین ہیں، اور کچھ فقہی تراشے آپ کے مجموعۂ مکاتیب "حدیث دوستاں" میں موجود ہیں، یہ اگرچیکہ آپ کے تفقہ کو سمجھنے کے لئے بہت ناکافی ذخیرہ ہے لیکن حضرت مولانا کی قانونی زرف نگاہی، کلیات و جزئیات کی معرفت اور فقہی مزاج و مذاق پر ان سے فی الجملہ روشنی ملتی ہے، اور جس طرح مولانا نے وقت کے حساس مسائل پر قلم اٹھایا اور جس بات کو حق سمجھا کسی رورعایت کے بغیر بے کم و کاست اسے پیش فرمایا، اس سے آپ کی زمانہ شناشی، جرأت اظہار اور حق گوئی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

بلاشبہ فقہی مسائل میں اختلافات ہوتے ہیں، اور اس میں کوئی برائی نہیں ہے، کبھی صورت واقعہ کے سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے، اور کبھی بروقت دلائل تک رسائی نہیں ہو پاتی، لیکن اگر خلوص کے ساتھ حق تک پہونچنے کی پوری کوشش کی گئی ہو تو جانب خطا میں بھی ثواب ہے، حضرت مولانا بھی ایک

فقیہ تھے، آپ کی رائے سے بھی اختلاف کیا جاسکتا ہے، آپ نے بھی کئی مسائل میں دوسرے علماء سے اختلاف کیا ہے، کبھی سخت، کبھی نرم، مگر یہ حق ہے کہ آپ نے جو کچھ لکھا حق سمجھ کر لکھا، اس میں کسی بے جا عصبیت یا تنگ نظری کا دخل نہیں تھا۔

اب ایک نظر آپ کے چند مطبوعہ فقہی مضامین پر ڈال لیتے ہیں جن سے فقہی مسائل میں مولانا کی دقت نظر کا اندازہ ہوگا:

عنین کے فسخ نکاح کا مسئلہ

☆"علوم و نکات "میں پہلا فقہی مقالہ مسئلۂ عنین پر ہے، یہ اصلاً ایک کتابچہ بسلسلۂ فیصلۂ عنین کا جواب ہے، جو محکمۂ شرعیہ مئو نے شائع کیا تھا، اور اس کی تائید دارالعلوم دیوبند اور امارت شرعیہ پٹنہ اور دیگر اکابر نے کی تھی، مولانا نے اس کا رد لکھا اور ایک فرضی نام سے کتابچہ کی صورت میں شائع فرمایا، کتابچہ کا نام تھا" محکمۂ شرعیہ جمعیۃ العلماء مئوناتھ بھنجن کے ایک اہم فیصلۂ فسخ نکاح کا تحقیقی و تفصیلی جائزہ"، یہ غالباً ۱۹۷۹ء کی بات ہے، جب مولانا مدرسہ وصیۃ العلوم الٰہ آباد میں مدرس تھے، اور حقیر راقم السطور اس مدرسہ میں زیر تعلیم تھا، مولانا میرے سرپرست تھے، اس وقت تو مجھے اس کا شعور نہیں تھا، میری عمر بمشکل دس سال تھی، میں نے یہ رسالہ پہلی بار مدرسہ دینیہ غازی پور میں پڑھنے کے زمانے میں مولانا کے پاس دیکھا، مولانا نے یہ رسالہ یہ کہہ کر مجھے عنایت فرمایا کہ "الٰہ آباد میں تم دونوں بھائی آپس میں جھگڑنے میں رہتے تھے اور ہم یہ کام کرتے تھے "وہ رسالہ عرصہ تک میرے پاس محفوظ رہا، لیکن ابھی میں نے تلاش کیا تو نہ مل سکا۔

مولانا نے جب یہ کتابچہ لکھا بمشکل ان کی عمر اٹھائیس (۲۸) سال ہوگی، طبیعت میں امنگ اور ذہن و فکر میں جولانی تھی، اس کا اثر آپ کی تحریر میں موجود ہے، اس مضمون میں آپ کے لہجہ کا طمطراق دیکھنے کے لائق ہے۔

مسئلہ کی بنیاد اس پر ہے کہ عام ضابطہ کے مطابق عنین کو علاج کے لئے ایک سال کی مہلت دی جاتی ہے، لیکن اگر میڈیکل رپورٹ اس کو ناقابل علاج قرار دے تو کیا اس صورت میں بھی اس

ضابطہ کی تکمیل ضروری ہوگی، یا قاضی اپنی صوابدید اور قانونی بصیرت کی بنیاد پر ایک سال سے قبل ہی تفریق کا فیصلہ کر سکتا ہے؟ مطبوعہ فیصلہ کی اساس دوسری جہت پر تھی، یعنی مریض کو قاضی نے لاعلاج قرار دے کر یا مجبوب کے ساتھ ملحق کر کے ایک سال سے قبل ہی تفریق کا فیصلہ کر دیا تھا، کہ اس کو مہلت دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، عورت کا وقت برباد کرنا ہے، فقہاء نے مہلت دینے کا حکم ایسی صورت میں دیا ہے جب مریض کی شفایابی کی امید ہو، مولانا کو اس سے اختلاف تھا، مولانا کے نزدیک عنین کو ہر حالت میں ایک سال کی مہلت ملنی چاہئے، اس لئے کہ کسی مریض کے لاعلاج ہونے کا فیصلہ اسی مہلت پر انحصار کرتا ہے، یہ حکم شرعی ہے اور یقینی ہے، ڈاکٹری رپورٹ ظن پر مبنی ہے، نیز رپورٹوں میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے، جیسا کہ مریض نے بعض دوسرے ڈاکٹروں سے اپنی صحتیابی کی سند حاصل کر لی تھی، ظاہر ہے اختلاف کی صورت میں یہ مسئلہ ظن سے بھی نیچے چلا جاتا ہے، تو کیا محض شک کی بنیاد پر کسی متفق علیہ حکم شرعی کو منسوخ کرنے کی گنجائش ہوگی؟۔۔۔ یہاں ایک دوسری چیز صغر آلہ کا معاملہ ہے کہ بعض شکلوں میں یہ مجبوب کے درجہ میں ہو جاتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ اس کے لئے بھی ڈاکٹری معائنہ کی ضرورت ہے، اور پھر وہی ظن اور شک کا مسئلہ پیدا ہوگا، اس طرح مولانا نے انتہائی مدلل انداز میں اپنے موقف کو ثابت کیا، آپ کا مستدل اس نوع کی عبارت ہے، جو الفاظ کے فرق کے ساتھ مختلف کتابوں میں آئی ہے:

وفي الْمُحِيطِ وَالْإِمَامُ الْمُتَّبَعُ في أَحْكَامِ الْعِنِّينِ عُمَرَ وَعَلِيٌّ وابن مَسْعُودٍ وابن عَبَّاسٍ رضي اللَّهُ عَنْهُمْ ولم يُنْقَلْ عن أَقْرَانِهِمْ خِلَافُهُ فَحَلَّ مَحَلَّ الْإِجْمَاعِ وَلِأَنَّ عَدَمَ الْوُصُولِ قد يَكُونُ لِعِلَّةٍ مُعْتَرِضَةٍ وقد يَكُونُ لِآفَةٍ أَصْلِيَّةٍ فَلَا بُدَّ من ضَرْبِ مُدَّةٍ لِاسْتِبَانَةِ الْعِلَّةِ من الْعُنَّةِ فَقُدِّرَ بِسَنَةٍ لِاشْتِمَالِهَا على الْفُصُولِ الْأَرْبَعِ اه وقد كَتَبْنَا في الْقَوَاعِدِ الْفِقْهِيَّةِ في مَذْهَبِ الْحَنَفِيَّةِ أَنَّ قَاضِيًا لو قَضَى بِعَدَمِ تَأْجِيلِ الْعِنِّينِ لم ينفذ

(ينفد)قَضَاؤُهُ ولم يُقَيِّدْ الْمَرْأَةَ بِشَيْءٍ[45]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مقالہ زیر بحث قضیہ کے پس منظر اور استدلال کی قوت کے لحاظ سے آپ کی فقہی بصیرت اور علمی اعتماد کا بہترین نمونہ ہے[46]۔

اذان میں لفظ اللہ کے مد کی تحقیق

☆اسی زمانے میں مولانا نے ایک مضمون اذان میں لفظ اللہ کے مد کی تحقیق پر لکھا، اور مضبوط دلائل سے ثابت کیا کہ یہ مد اصطلاحی نہیں بلکہ مدصوت ہے، جو اذان میں مطلوب ہے، نیز اذان میں قرآن کریم کی طرح قواعد تجوید کی پابندی ضروری نہیں ہے، غیر قرآن میں فقہاء اور قراء دونوں نے مقصود پر نگاہ رکھی ہے، قواعد کی سنگینیوں کا اسے پابند نہیں کیا ہے، مولانا نے استدلال میں کتب حدیث وفقہ وتجوید سے بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں، مثال کے طور پر یہ عبارت:

وقيل بتطويل الكلمات كمافي البحر عن عقد الفرائدوكل ذلك مطلوب في الأذان فيطول الكلمات بدون تغن وتطريب كما في العناية[47]

مولانا کا یہ مقالہ بھی "المد التعظیمی لاسم الجلالۃ" کے نام سے کتابچہ کی صورت میں مکتبہ نعمانیہ دیوبند سے شائع ہوا، اور یہ نام حضرت الاستاذ مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے تجویز فرمایا، اور اس رسالہ کی طباعت کا انتظام بھی انہوں نے ہی کیا تھا[48]۔

---

[45] - البحرالرائق شرح كنزالدقائق ج 4 ص 135زين الدين ابن نجيم الحنفي سنة الولادة 926ھ/ سنة الوفاة 970ھ الناشردارالمعرفة مكان النشربيروت

[46] - تفصیل کے لئے دیکھئے: علوم ونکات ج ا ص ۲۷ تا ۶۲

[47] - حاشية على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح ج 1 ص 131أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحاوي الحنفي سنة الولادة / سنة الوفاة 1231ھ الناشر المطبعة الكبرى الأميرية ببولاق سنة النشر 1318ھ مكان النشر مصر عدد الأجزاء

[48] - تفصیل کے لئے دیکھئے: علوم ونکات ج ا ص ۶۳ تا ۸۱

ہندوستان میں تقرر قاضی کا مسئلہ

☆مولانا کا ایک معرکۃ الارآء مضمون "شرعی پنچایت یا قاضی" کے نام سے شائع ہوا تھا، جس میں مختلف فقہی عبارتوں کو سامنے رکھ کر یہ ثابت کیا گیا تھا کہ ہندوستان جیسے دارالکفر میں اگر مسلمان اپنے طور پر قاضی کا تقرر کریں تو اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے، یہاں کے نظام کا حل صرف شرعی پنچایت ہے، دارالکفر میں مسلمانوں کی ذمہ داری قاضی کے انتخاب کی نہیں، بلکہ امیر کے انتخاب کی ہے ،اور قاضی کا تقرر امیر کرے گا، یا خود فیصلے کرے گا، اس لئے کہ بزازیہ میں ہے:

اذااجتمع اهل البلدة وقدموارجلاًعلى القضاء لايصح لعدم الضرورة وان مات سلطانهم واجتمعواعلىٰ سلطنة رجل جازللضرورة [49]

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مسلمان خود سے قاضی کا تقرر کرلیں تو درست نہیں ہے، اس لئے کہ ایسے موقعہ پر ضرورت قاضی کے انتخاب کی نہیں بلکہ امیر کے انتخاب کی ہے۔

رہی وہ عبارت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

يصير القاضى قاضياًبتراضى المسلمين ،فيجب عليهم ان يلتمسوا اليأمسلماًمنهم[50]

کہ مسلمانوں کی تراضی سے قاضی کا تقرر درست ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر غیر مسلم حکومت مسلمانوں کے لئے قاضی مقرر کرے اور مسلمان اس سے راضی ہوں تو شرعاً اس کا تقرر معتبر ہو گا، لیکن اگر مسلمان اسے مسترد کردیں تو شرعاً قاضی نہیں بنے گا، اس طرح مولانا نے اس موضوع کی مختلف فقہی عبارتوں کے درمیان تطبیق دی کہ اصل یہ ہے کہ نصب قاضی کا کام امیر اور حکومت کا ہے خواہ مسلمان حکومت ہو یا کافر، البتہ کافر میں صحت کی شرط یہ ہے کہ مسلمان بھی اپنی رضامندی کا اظہار کریں، اس لئے جن عبارتوں میں تراضی مسلمین سے نصب قاضی کی صحت کی بات آئی ہے وہ حکومت کافرہ کی جانب سے مقرر کردہ قاضی پر محمول ہیں[51]۔

---

[49] -بزازیۃ علی العالمگیریۃ ج ۵ ص ۱۳۰

[50] -شامی ج 4 ص 308

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ حضرت مولانا کی فقہی رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے ،خود مجھے بھی مولانا کی کئی فقہی آراء سے اتفاق نہیں ہوا، ان میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے، میں نے اس مسئلہ کی تفصیل حیات ابو المحاسن میں لکھی ہے[52]، تفصیل کے لئے وہاں مراجعت کی جائے۔

میرے نزدیک مسئلہ کی تفصیل اس سے مختلف ہے ،اوراس تفصیل کے مطابق عبارتوں کے درمیان زیادہ بہتر تطبیق پیدا ہوتی ہے، میرے نزدیک مسئلہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ جن ملکوں میں امیر کی جانب سے نصب قاضی ممکن ہو خواہ وہ حکومت کافرہ ہی کیوں نہ ہو، وہاں قاضی کا تقرر امیر یا حکومت کی جانب سے ضروری ہے ،عام مسلمانوں کا تقرر معتبر نہیں ہو گا، جیسا کہ مسلم ملکوں میں ہوتا ہے یاہندوستان میں ۱۸۶۴ء تک، جب یہاں کے قانون میں نصب قضا کی دفعہ موجود تھی، اور برطانوی حکومت کی جانب سے قاضیوں کا تقرر جاری تھا، وغیرہ، لیکن جن ملکوں یا علاقوں میں امیر یا حکومت کے ذریعہ نصب قاضی کی کوئی صورت موجود نہ ہو وہاں مسلمانوں کی پہلی ذمہ داری بلاشبہ نصب امیر کی ہے ،لیکن اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو یا تاخیر ہوتی ہو تو مسلمان اپنا قاضی اور جمعہ وغیرہ کا امام خود مقرر کر سکتے ہیں، اس لئے کہ مسلمانوں کے کئی مسائل کا انحصار قضاء قاضی پر ہے ،اوران کو مؤخر کرنے میں حرج عام پیش آئے گا، جیسا کہ ہندوستان میں ۱۸۶۴ء کے بعد حالات پیدا ہوئے، جس کا تسلسل تاحال جاری ہے۔ اس طرح جس عبارت میں عوام کی جانب سے نصب قاضی کو باطل قرار دیا گیا ہے اس کا محمل وہ علاقہ ہے جہاں نصب قاضی کے لئے امیر یا حکومت موجود ہو، اس لئے کہ وہاں یہ ایک بے ضرورت عمل ہو گا، اور جن عبارتوں میں عوام کی جانب سے تقرر قاضی کو درست قرار دیا گیا ہے ان کا محمل وہ علاقہ ہے جہاں امیر یا حکومت کی جانب سے نصب قاضی کا انتظام نہ ہو۔

اس ضمن میں علماء متقدمین میں قاضی عبد الرحمن بن احمد الایجیؒ کی یہ عبارت بہت اہم اور فیصلہ کن ہے جو انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "المواقف" میں تحریر کی ہے:

---

51 ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: علوم و نکات ج ۱ ص ۱۳۵ تا ۱۴۲

52 ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: حیات ابو المحاسن ص ۵۱۶ تا ۵۳۳ مؤلفہ اختر امام عادل قاسمی، ناشر: جامعہ ربانی منورواشریف، ۲۰۱۹ء

"لانسلم عدم انعقادالقضاء بالبیعۃللخلاف فیہ،وان سلم فذلک عندوجودالامام لامکان الرجوع الیہ فی ھذا المھم واماعندعدمہ فلابد من القول بانعقادہ بالبیعۃ تحصیلاً للمصالح المنوطۃ بہ ودرءاً للمفاسد المتوقعۃ دونہ[53]۔

اسی طرح کی تصریحات فقہاء حنابلہ اور شافعیہ کے یہاں بھی موجود ہیں[54]۔

خود حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے الحیلۃ الناجزۃ کی تصنیف کے زمانہ میں علماء مالکیہ کے سامنے جب یہ سوال رکھا تھا کہ اگر مسلمان غیر مسلم حکومت کے تحت ہوں اور وہاں حکومت کی طرف سے کوئی قاضی مقرر نہ ہو، تو کیا عام مسلمانوں کی جانب سے قاضی کا تقرر درست ہوگا؟ جب کہ قاضی کو قوت تنفیذ حاصل نہیں ہوگی۔

اس کا جواب حرم نبوی کے مالکی عالم شیخ عبد اللہ الموتی نے ان الفاظ میں تحریر کیا:

لامانع من ذلک اذااضطرالناس الیٰ ذلک بمادل علیہ ظاھر کلام اھل المذھب[55]

یعنی اگر لوگوں کو واقعی اس کی ضرورت ہو تو مذہب میں بظاہر اس کی ممانعت نہیں ہے۔

رہا شرعی پنچایت کا مسئلہ تو حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کے مقالہ میں اس سلسلہ میں کوئی زیادہ تفصیل موجود نہیں ہے، البتہ شرعی پنچایت میں عملی دشواری بہت زیادہ ہے، نیز یہ مسلمانوں کے مسائل کا کوئی مستقل حل نہیں ہے، بلکہ ایک عارضی چیز ہے جس کو فقہاء مالکیہ نے پیش کیا ہے، فقہ حنفی میں اس کا کوئی تصور نہیں ہے، فقہ حنفی میں اس کے لئے نظام قضاء موجود ہے، ظاہر ہے کہ جب فقہ حنفی کے مطابق نظام قضا پر عمل کرنا ممکن ہے تو مسلک حنفی سے عدول کر کے مسلک مالکی کو اختیار کرنے کی ضرورت کیا ہے؟

---

53 - المواقف فی علم الکلام ص ۳۹۹ طبع عالم الکتب بیروت۔

54 - الاحکام السلطانیۃ للقاضی ابی یعلیٰ ص ۷۳، ☆ الاحکام السلطانیۃ للامام ابی الحسن الماوردیؒ (متوفیٰ ۴۵۰ھ) ص ۶۴، ۶۳ مطبعۃ السعادۃ مصر، ☆ الفتاویٰ الکبریٰ لابن حجر مکی الہیثمی الشافعی ج ۴ ص ۳۲۶ ☆ فتح المعین ص ۲۱۱، ۲۱۰۔

55 - الحیلۃ الناجزۃ ص ۲۵۵ مکتبہ رضی دیوبند، ۲۰۰۵ء۔

حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند وصدر اول آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"حضرت تھانویؒ نے شرعی کمیٹی کے نام سے فقہ مالکی کی رو سے جو حل پیش فرمایا ہے، وہ اپنے زمانے کے اعتبار سے اہم اقدام ہے، لیکن اس میں بڑی دشواری یہ ہے کہ فقہ مالکی کی رو سے تمام ارکان کمیٹی کا اتفاق فیصلہ میں ضروری ہے اگر یہ اتفاق حاصل نہ ہو سکے تو دعویٰ خارج کر دیا جائے گا[56]

☆علاوہ ازیں خود فقہ مالکی میں جماعت المسلمین (شرعی پنچایت) کے اختیارات بہت محدود ہیں، بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں یہ محض عارضی حل ہے، ان کے نزدیک بھی حقیقی حل نظام قضا ہی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی مقام پر قاضی موجود ہو تو جماعۃ المسلمین کو حق تفریق حاصل نہیں ہوتا، فقہ مالکی میں اس کی تصریحات موجود ہیں:

والنقل أنهاإن أرادت الرفع ووجدت الثلاثةوجب للقاضي،فإن رفعت لغيره حرم عليهاوصح،وإن رفعت لجماعةالمسلمين مع وجود القاضي بطل، فإن لم يوجدقاض فتخير فيهما[57]

بہر حال اس اختلاف رائے کے باوجود مولانا کی فقہی رائے کا احترام اپنی جگہ مسلم ہے، انہوں نے جس طرح مختلف فقہی عبارتوں میں تطبیق کی صورت پیدا کی وہ ان کی علمی عبقریت کی دلیل ہے۔

فقہی سیمیناروں کی مناسبت سے تحریر کردہ مقالات

☆مولانا نے بعض مقالے فقہی سیمیناروں کے لئے بھی یا ان کی مناسبت سے تحریر فرمائے

---

[56] - نظام قضاء کا قیام ص ۱۶، ۱۵ شائع کردہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔

[57] - الشرح الكبير ج ۲ ص ۴۷۹ المؤلف : أبو البركات أحمد بن محمد العدوي ، الشهير بالدردير (المتوفى : 1201ھ)وكذا فى حاشية الدسوقي على الشرح الكبير ج ۱۰ ص ۱۲۱ المؤلف : محمد بن أحمد الدسوقي (المتوفى : 1230ھ) وكذا فى منح الجليل شرح على مختصر سيد خليل. ج ۴ ص ۳۱۷ محمد عليش.الناشر دار الفكرسنة النشر 1409ھ – 1989م.مكان النشر بيروت عدد الأجزاء 9 .

مثلاً:

☆نوٹوں کی شرعی حیثیت اور ان سے قرض کی ادائیگی کا مسئلہ [58]

☆زکوٰۃ[59]

☆فی سبیل اللہ [60]

☆مصارف زکوٰۃ[61]

☆دارالحرب میں ربوا کی شرعی حیثیت [62]

اس مقالہ میں آپ نے ثابت کیا ہے کہ دارالحرب میں کافر کا مال محل ربوا ہی نہیں بنتا، اس لئے مالک کی رضامندی سے اس کا استعمال جائز ہے، یہ اصطلاحی سود نہیں ہے، مقالہ بہت علمی اور مدلل ہے، یہی رائے ماضی قریب کے اکابر میں حضرت علامہ مناظر احسن گیلانیؒ کی بھی تھی، اس موضوع پر ان کی مستقل کتاب موجود ہے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ان کا رد لکھا تھا، حضرت مفتی محمد یحیٰ قاسمیؒ (دربھنگہ) سابق مفتی دارالعلوم حیدرآباد بھی اسی نظریہ پر عامل تھے، اسلامک فقہ اکیڈمی کے سیمینار میں میں نے دیکھا کہ اور بھی کئی حضرات کی یہی رائے تھی، لیکن اکثر علماء کی رائے کا لحاظ کرتے ہوئے ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے سود کی حرمت کا فیصلہ کیا گیا۔

☆گاؤں میں جمعہ کے جواز پر بھی آپ کا ایک بصیرت افروز مقالہ ہے جس میں حنفیہ کے اصول پر مصر کی شرط کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ مقالہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تحقیق پر مبنی ہے، جو ان کے ایک مکتوب سے ماخوذ ہے، ماضی میں اور بھی کئی اکابر کا یہ موقف رہا ہے [63]۔

---

58 ۔علوم و نکات ج ۱ ص ۸۲ تا ۹۵

59 ۔علوم و نکات ج ۱ ص ۱۴۳ تا ۱۶۴

60 ۔علوم و نکات ج ۱ ص ۱۶۵ تا ۱۸۳

61 ۔علوم و نکات ج ۱ ص ۱۸۴ تا ۲۰۱

62 ۔علوم و نکات ج ۱ ص ۹۶ تا ۱۱۹

63 ۔علوم و نکات ج ۱ ص ۱۲۰ تا ۱۳۴

☆ آپ کا ایک تفصیلی فتویٰ مسئلۂ رفع یدین پر موجود ہے جس میں ترک رفع یدین کو صحیح احادیث سے ثابت کیا گیا ہے، فتویٰ انتہائی مدلل اور علمی ہے[64]۔

فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کا ثبوت

☆ نماز کے بعد اجتماعی دعا کے ثبوت پر مولانا کے تین (۳) مکاتیب (حدیث دوستاں) میں ہیں ، اگر ان کو ایک مسلسل مضمون کی شکل دے دی جائے تو نماز کے بعد اجتماعی دعا کے ثبوت پر ایک بہترین فقہی مقالہ بن جائے گا، متعلقہ موضوع پر مولانا کی یہ تحریر تقریباً اکیس (۲۱) صفحات میں پھیلی ہوئی ہے، مولانا نے مضبوط دلائل سے ثابت کیا ہے کہ نماز کے بعد اجتماعی دعا کو بدعت قرار دینا درست نہیں، اس لئے کہ نماز کے بعد فی الجملہ دعا کا ثبوت عہد نبوت سے بلکہ خود نبی کریم ﷺ سے ہے، اور ایک دو بار ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا بھی نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے بالخصوص نفل نمازوں کے بعد، بعد میں یہ چیز فرائض میں بھی جاری ہو گئی، اور باقاعدہ اس کا اہتمام کیا جانے لگا، اور سنن ومستحبات کی یہی شان ہوتی ہے کہ ان کا ثبوت فی الجملہ نبی کریم ﷺ سے ہے، دوام کا ثبوت صرف فرائض میں مطلوب ہے، سنن ومستحبات میں نہیں، اسی ضمن میں بدعت کی مختلف اقسام پر بھی آپ نے مدلل بحث فرمائی ہے، حضرت مولاناؒ نے اس تحریر میں حافظ ابن حجرؒ کی فتح الباری اور علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کی فیض الباری وغیرہ سے استفادہ کیا ہے، اور انتہائی تشفی بخش گفتگو کی ہے، فرحمہ اللہ[65]۔

(۴)

علم تصوف واخلاق اور خدمات جلیلہ

☆ تصوف واخلاق آپ کا سب سے پسندیدہ موضوع تھا، اس کو آپ تمام علوم ومعارف کا لب لباب اور ساری محنتوں کا حاصل سمجھتے تھے، آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ اہل اللہ اور مشائخ کی صحبتوں میں

---

64 ۔علوم ونکات ج ا ص ۲۰۲ تا ۲۱۰

65 ۔دیکھئے حدیث دوستاں ص ۵۹۳ تا ۶۱۴ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر مکتبہ ضیاء الکتب

گذرا، وقت کے اکثر مشائخ سے آپ کے گہرے روابط رہے، اور ہر ایک کی شفقتیں اور عنایتیں آپ کو حاصل ہوئیں۔

تصوف پر آپ کا عظیم الشان قلمی سرمایہ

آپ کی تحریری خدمات کا سب سے بڑا حصہ تصوف وصوفیاء، تربیت اخلاق اور اصلاح امت سے متعلق ہے، آپ کی زیادہ تر کتابیں اور مضامین اسی موضوع پر ہیں مثلاً:

(۱) تصوف ایک تعارف (۲) اخلاق العلماء (۳) دین داری کے دو دشمن – حرص مال وحب جاہ (۴) فتنوں کی طغیانی: ٹی وی سے متعلق ایک فکر انگیز تجزیہ (۵) مالی معاملات کی کمزوریاں اور ان کی اصلاح (۶) منصب تدریس اور حضرات مدرسین (۷) خواب کی شرعی حیثیت (۹) رمضان المبارک نیکیوں کا موسم بہار (۱۰) مروجہ جلسے! بے اعتدالیاں اور ان کی اصلاح (۱۱) تکبر اور اس کا انجام (۱۲) اذکار وافکار (سلسلۂ عالیہ قادریہ حمادیہ) (۱۳) حیات مصلح الامت (تذکرہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ الٰہ آبادیؒ) (۱۴) تہجد گذار بندے (۱۵) تذکرہ شیخ ہالیجویؒ (سوانح حیات حضرت مولانا حماد اللہ صاحب ہالیجویؒ، سندھ پاکستان) (۱۶) حیات سراج الامت (تذکرہ حضرت مولانا سراج احمد صاحب امروہویؒ (۱۷) حضرت چاند شاہ صاحبؒ (ٹانڈوی) اور ان کا خانوادۂ تصوف (۱۸) ذکر جامی (سوانح حیات حضرت مولانا عبد الرحمن جامیؒ) (۱۹) تذکرہ مولانا عبد القیوم صاحب فتح پوریؒ (۲۰) نمونے کے انسان (۲۱) تعویذات وعملیات کی حقیقت وشرعی حیثیت (۲۲) کاروان حرم (واقعات سفر حج حضرت سید احمد شہید) وغیرہ۔

اس طرح آپ نے تصوف واخلاق اور اصلاح امت پر ایک پوری لائبریری تیار کر دی۔

تصوف کا آپ نے گہرا مطالعہ کیا تھا، اس کے معارف اور رموز ونکات پر آپ کی عمیق نگاہ تھی، اور اس کو آپ ایمانی کامیابی کی آخری کلید قرار دیتے تھے، میں نے بارہا آپ سے سنا کہ لوگ کہتے ہیں کہ تصوف کا ثبوت کہاں سے ہے، اور مجھے قرآن وحدیث کے اکثر نصوص میں تصوف ہی تصوف

نظر آتا ہے "آپ نے اپنے قلم کے ذریعہ تصوف کا بہترین تعارف پیش کیا، آپ کی کتاب "تصوف ایک تعارف" اپنے موضوع پر ایک شاہکار کتاب ہے، جو کئی مقالات کا مجموعہ ہے۔

آپ کی تحریرات میں تصوف کے کئی علمی مسائل کی بہترین تشریحات ملتی ہیں، یہاں بطور نمونہ ایک دو چیزیں پیش کی جاتی ہیں:

صوفیاء کے یہاں مسئلۂ وحدۃ الوجود

☆ وحدۃ الوجود تصوف کا انتہائی قدیم اور پیچیدہ مسئلہ ہے، مگر مولانا نے اس کی ایسی عام فہم تشریح فرمائی کہ اس کو سمجھنا اور برتنا دونوں آسان ہو جاتا ہے، لکھتے ہیں:

"وحدۃ الوجود کی بحث ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، ایک تو اس کی علمی حیثیت ہے کہ آدمی یہ علم رکھے کہ وجود جسے وجود کہا جاسکتا ہے، وہ تو ایک ہی ہے، مثلاً دن میں روشنی تو ایک ہی ہے سورج کی، پھر اسی سورج سے آئینہ بھی روشنی حاصل کرتا ہے، تو گو آئینہ بھی روشن ہے، مگر اصل روشن تو سورج ہے، اسی سے حاصل کر کے آئینہ میں بھی روشنی کی جلوہ گری ہے، اسی طرح کائنات تو معدوم محض ہے، اصل وجود اور موجود تو ایک ہی ہے، اور اسی وجود کا ظل ہے جو کائنات اور مخلوقات کی صورت میں ہمیں نظر آرہا ہے۔

یہ ایک علمی مسئلہ ہے، لیکن اس علم کو جب کوئی شخص بطور شغل کے اپنے دل ودماغ میں جماتا ہے، اس کا مراقبہ کرتا ہے، تو کثرت تمرین سے اس کا ایک حال پیدا ہو جاتا ہے، اس وقت وہ عیاناً دیکھتا ہے کہ صرف خدا موجود ہے، اور باقی سارا جہاں فانی اور مضمحل ہے، اور کائنات میں جتنے خیر و شر کا وجود و ظہور ہو رہا ہے سب کا مبدأ بدایتاً اسی ایک ذات کو پاتا ہے، ایسی حالت میں اگر خدا تعالیٰ کی محبت تام نہ ہو تو وہ خدا سے ناراض اور بدگمان ہو بیٹھے گا، کیوں کہ جب کوئی تکلیف دہ چیز اس پر پڑے گی، تو وہ اسے برا سمجھے گا، اور جب اس کا آغاز کار عیاناً خدا کی

طرف سے دیکھے گا، تو وہ خدا ہی سے ناراض ہو جائے گا، اور اس طرح اپنا ایمان بگاڑ لے گا، اس کے بر خلاف ہم لوگ جن کو وحدۃ الوجود کے حال سے مس نہیں ہے، جب کسی بات کو خلاف مزاج پاتے ہیں، اور اس سے تکلیف محسوس کرتے ہیں، تو اسے اسباب کی طرف منسوب کر کے مطمئن ہو لیتے ہیں، خدا تک بات نہیں پہونچتی، در حقیقت یہ اسباب ہمارے ایمان کے لئے محافظ ہیں، ورنہ اگر براہ راست ہر چیز کو خدا کی طرف منسوب کرنے کا حال پیدا ہو جائے، تو ایمان کا بچنا مشکل ہو جائے گا[66]۔

تصور شیخ

☆صوفیاء کے یہاں ایک عمل "تصور شیخ" معروف ہے جس میں صورت شیخ کو واسطہ بنا کر طالب فیضان الٰہی کا خواستگار ہوتا ہے، اس کو اصطلاح میں "شغل برزخ" اور "رابطہ" بھی کہتے ہیں، یہ تمام صوفیاء کے یہاں رائج ہے، مگر حضرت سید احمد شہیدؒ کے حالات میں آتا ہے کہ جب ان کے پیر و مرشد حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے ان کو شغل برزخ کی تلقین فرمائی تو انہوں نے عرض کیا کہ یہ تو شرک ہے، اس پر حضرت شاہ صاحبؒ نے حافظ شیرازیؒ کا یہ شعر پڑھا:

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

سید صاحب گویا ہوئے کہ سجادہ کو شراب میں رنگین کرنا صرف معصیت ہے، اس میں تاویل کی جا سکتی ہے، لیکن تصور شیخ تو شرک ہے، کہ انسان خدا کی جگہ بندہ کا دھیان کر کے بیٹھ جائے، اس کی گنجائش کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ سن کر حضرت شاہ صاحب بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ تم کو کمالات نبوت

---

66 -اعجاز نامے ص ۱۷۶، ۱۷۷ مکاتیب حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، تلاش و تدوین: مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی، ناشر مکتبہ ضیاء الکتب، خیر آباد مئو، ۲۰۱۹ء

سے مناسبت ہے، تمہارا سلوک دوسرے طریق سے طے ہو گا"

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی سے جب اس نظریہ اور مذکورہ سوال وجواب کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے تصور شیخ کی ایسی تشریح فرمائی کہ سب اشکالات خود بخود رفع ہو گئے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"اس کی حقیقت بس اتنی ہے کہ مرید خود کو اپنے شیخ کے سامنے تصور کرتا ہے، اور خیال کرتا ہے کہ فیضان الٰہی کی لہریں شیخ کے قلب سے ہو کر اس کے قلب میں آرہی ہیں، اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ فیضان الٰہی کے نزول کا واسطہ اس کے حق میں اس کا شیخ ہی ہے، لا الٰہ الا اللہ کے بعد محمد رسول اللہ کے تعلق پر غور کروگے، تو اس کی تہ میں اس رابطہ کی حکمت کارفرما نظر آئے گی، بھلا اس تصور میں کیا مضائقہ ہے، مرید نہ تو اپنے شیخ کو خدا سمجھتا ہے، نہ خدا کی طرح قابل تعظیم سمجھتا ہے، نہ اس کے سامنے جھکتا ہے، نہ اس کی عبادت کرتا ہے، اس کو بس اپنے اور خدا کے درمیان رابطہ تصور کرتا ہے، ہاں اگر بالاستقلال یہ عمل کیا جائے، اور شیخ ہی کو مقصود و مراد بنالیا جائے تو بلاشبہ یہ شرک ہو گا، جن بزرگوں نے اس کو شرک کہا ہے انہوں نے اسی معنی میں کہا کہ عام طور پر جہلاء تمیز نہیں کرسکتے ہیں علاوہ حضرت سید صاحبؒ کے شرک سے مراد شرک شریعت نہیں بلکہ شرک طریقت ہے، دراصل یہ ریاضت ابتدائی طالبین کے لئے مفید ہے، لیکن منتہیوں کے لئے یا جن کو براہ راست اللہ پاک سے رابطہ حاصل ہو جاتا ہو ان کے لئے یہ شرک طریق ہے، کہ خدا تک پہونچنے کے بعد پھر اس مقام پر غیر اللہ کو جگہ دی جائے، سید صاحب انہی لوگوں میں سے تھے، چنانچہ جب حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کو ان کی گفتگو سے اندازہ ہو گیا کہ ان کی شان الگ ہے تو ان کو اس قاعدہ سے مستثنیٰ فرمادیا، اور یہ ارشاد فرمایا کہ تم کو کمالات نبوت سے مناسبت حاصل

ہے، ایسے شخص کو براہ راست اللہ پاک سے رابطہ قائم ہو جاتا ہے، اس کو تصور شیخ کی ضرورت نہیں رہتی، اس لئے تمہارا سلوک دوسرے طریق سے طے کیا جائے گا، اگر خدانخواستہ سید صاحب کی مراد شرک شریعت ہوتی تو پھر انہوں نے شاہ صاحب کو اپنا مرشد کیونکر بنایا، نیز شاہ صاحب نے بھی کسی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا؟[67]۔

مولانا کی اس تقریر سے تصوف کا یہ مشہور مسئلہ پوری طرح روشن ہو جاتا ہے، مزید تفصیل کے لئے دیگر کتب تصوف کا مطالعہ کیا جائے۔

(۵)

علم کلام اور معقولات

مولانا کی عظیم معقولی شخصیت کا انکشاف

☆مولانا کے علمی سرمایہ کا بڑا حصہ کلامی اور منطقی مسائل پر مشتمل ہے، علوم معقولہ میں تو آپ کو ایسا درک حاصل تھا کہ گویا درجۂ اجتہاد پر فائز تھے اور بہت سے امور میں خود اپنی رائے رکھتے تھے، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ شروع طالب علمی میں مجھے مولانا کی اس بے پناہ صلاحیت کا شعور نہیں تھا، گو کہ منطق و فلسفہ کی کئی کتابیں مجھے آپ سے پڑھنے کا شرف حاصل تھا، قطبی، سلم اور میبذی میں نے مولانا ہی سے پڑھی تھیں، مگر یہاں ان کا انداز وہی روایتی تھا، جو عام طور پر اس فن کے پڑھانے والے اساتذہ کا ہوتا ہے، بلکہ جس طرح انہوں نے قطبی اور سلم کے اسباق درمیان ہی میں چھوڑ دیئے تھے، اس سے مجھے خیال پیدا ہوا تھا کہ مولانا ان فنون سے دور رہنا چاہتے ہیں، لیکن دیوبند پہونچنے کے بعد جب بعض عقلی مسائل میں مجھے مشکلات پیش آئیں، اور میں نے بذریعۂ خط آپ سے رجوع کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ معقولات تو اس مرد درویش کے گھر کی لونڈی ہے، اور آپ کو ان میں ایسی مجتہدانہ بصیرت

---

67 - حدیث دوستاں ص ۶۷۷ تا ۶۸۲ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر مکتبہ ضیاء الکتب

حاصل تھی کہ شاید اس دور میں کم ہی لوگ اس درجہ کا عبور رکھتے ہوں، اب تک کے مولانا سے میں اتنا متاثر نہیں ہوا تھا جتنا ان کی شخصیت کے اس رخ کے انکشاف سے ہوا، مجھ پر اس دور میں علوم عقلیہ کے ذوق کا غلبہ تھا، اور کسی انسان کی عظمت کے لئے اسی کو معیار سمجھتا تھا، مولانا کی اس شخصیت کے انکشاف کے بعد میں ان کا بندۂ بے دام ہو گیا۔

کلامی مباحث پر مولانا کے مکاتیب کا پس منظر

علوم قاسمیہ کا مطالعہ میں نے مدرسہ دینیہ غازی پور کی طالب علمی ہی میں شروع کر دیا تھا، جس کی اولین رہنمائی مولانا نے ہی کی تھی، دیوبند پہونچنے کے بعد کتابی سرمایہ میں اضافہ ہوا تو میرے اس ذوق نے اور ترقی کی، میرے درس میں شرح عقائد (فی الجملہ) کو چھوڑ کر معقولات کی کوئی کتاب تو شامل نہ تھی لیکن خارج درس موقعہ نکال کر میں ایسی کتابوں کی تلاش میں رہتا تھا، اسی دور میں براہین قاطعہ اور علوم قاسمی کی کئی کتابوں کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا۔

بزرگوں کے طرز تحریر کی نقالی-میرا عہد رفتہ

میں ان کتابوں سے اس درجہ متاثر تھا کہ خط و کتابت اور مضمون نویسی میں بھی انہی بزرگوں کے طرز تحریر کی نقالی کرتا تھا، اور اس میں ایسی مشق ہو گئی تھی کہ ایک بار حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحبؒ کو بھی شبہ ہو گیا کہ یہ عبارت میری ہے یا کسی کتاب سے لی گئی ہے، ایک خط میں انہوں نے اس کا ذکر فرمایا:

> "تم نے جو عبارت نقل کی ہے۔۔۔:" پھر یہ قدرت باری تعالیٰ کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو قدرت حقیقیہ حاصل ہے نہ کہ قدرت مجازی، اور قدرت حقیقیہ کا مطلب وقوع قدرت ہے، جیسے قدرت خلق قبل خلق حاصل ہے، حقیقی طور پر خلق کا محتاج نہیں، کلام اس کی صفت قدیمہ ہے، تو وہ کسی مخاطب اور سامع کا محتاج نہیں، اور کلام کا بھی محتاج نہیں، بلکہ وہ قبل کلام متکلم ہے، اسی طرح کذب جو کہ محال تحت قدرت ہے تو گویا حقیقۃً قدرت ہے، اور اس کا وقوع ہو چکا، تو خدا تعالیٰ

سے کذب بالفعل کا صدور لازم آئے گا، پس یہ محال کو مستلزم ہے، اور مستلزم محال کو محال ہوتا ہے، تو کذب باری تعالیٰ محال ہوا نہ کہ ممکن "۔۔۔۔۔۔ معلوم نہیں یہ الفاظ تمہارے ہیں، یا صاحب بوارق کی عبارت تم نے نقل کی ہے[68]۔

جب کہ یہ عبارت فی الواقع میری ہی تھی، کسی کتاب سے منقول نہ تھی، چنانچہ اس کے جواب میں اس حقیر نے اس کی وضاحت کی کہ:

"جس عبارت کا حضرت نے تنقیدی جائزہ لیا ہے، وہ الفاظ تو اسی حقیر کے ہیں، لیکن معانی مؤلف بوارق کے ہیں، صاحب بوارق نے اس کی تعبیریوں کی ہے، ملاحظہ ہو:

"اور اگر کذب باری تعالیٰ ممکن وتحت القدرۃ ہوگا، تو تحت قدرت ہونے کے سبب سے خدا تعالیٰ اوسکے ساتھ یعنی کذب کے ساتھ ازلاًوابداً متصف ہوگا، اس لئے کہ جس چیز پر اس کی قدرت ہے، اوسکے ساتھ وہ ازلاًوابداً متصف ہے، چنانچہ خدا تعالیٰ قبل خلق واحداث مخلوق کے خالق تھا، حقیقتاً، اور قبل مربوب کے وہ باری تھا، اور اس کے لئے ربوبیت ثابت تھی، اور اسی طرح قبل احیاء موتی وہ محیی تھا، حقیقتاً بسبب ثبوت قدرت کے ان امور پر "(پھر شرح فقہ اکبر کی ایک عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے) اس سے واضح ہے کہ جو تحت قدرت اس کے ساتھ خدا تعالیٰ ازلاًوابداً متصف، حقیقۃً نہ مجازاً، پس کذب پر اس کی قدرت ہوگی تو ازلاًوابداً حقیقۃً اس کذب کے ساتھ خدا تعالیٰ متصف ہوگا، اور نعوذ باللہ من ذلک کاذب بالفعل ہوگا "تمت کلمات صاحب البوارق[69]

---

68 - حدیث دوستاں ص ۵۱۴ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ

69 - مجموعۂ مکاتیب قلمی ص ۱۸ مؤلفہ اختر امام عادل قاسمی، نسخہ ۱۴۰۶ھ

مولانا کے علمی مکاتیب دقیق مضامین پر مشتمل ہیں

یہ تفصیل میں نے اس لئے عرض کی تاکہ آج کی نسل کو اندازہ ہوسکے کہ مولانا نے (حدیث دوستاں میں) جو علمی خطوط لکھے ہیں، وہ مضبوط علمی پس منظر میں تیار ہوئے تھے، وہ محض طفلانہ سوالات کے جوابات نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے اکثر خطوط السوال نصف العلم کامصداق ہیں، اگر وہ خطوط اور سوالات بھی قاری کے پیش نظر ہوں تو مولانا کے خطوط کو پوری طرح سمجھنے میں مدد ملے گی، اور پھر اندازہ ہوگا کہ حضرت الاستاذ نے علم کے کیسے کیسے دریا اپنے خطوط میں بہائے ہیں، آج جب کہ لوگوں کی ذہنی اور فکری صلاحتیں اتنی کمزور ہوگئی ہیں کہ عام طور پر اس موضوع کے سادہ مضامین سننے کا بھی ان میں تحمل نہیں ہے، ان کے لئے مولانا کے بیان کردہ دقیق مضامین کا سمجھنا کتنا مشکل ہوگا، اندازہ کیا جاسکتا ہے، خود مولانا نے اپنے ایک خط میں ایک ذہین عالم کے حوالے سے ان خطوط کو پڑھنے کی ذہنی ریاضت و مرعوبیت کا ذکر کیا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

> "اللہ کا شکر ہے کہ تمہاری وجہ سے ایک علم مدون ہوگیا۔ گو کہ کچھ زیادہ مفید نہیں ہے۔ ایک ذہین عالم نے ہماری تمہاری مراسلت پڑھ کر کہا کہ اس سے دماغ مرعوب و متاثر تو بہت ہوا، مگر قلب تاثر سے خالی رہا، اگر تفسیر و حدیث یا تصوف کے موضوع پر اتنی محنت کرتے تو دماغ کے ساتھ قلب بھی لطف اندوز اور محظوظ ہوتا[70]

مولانا سے میری علمی مراسلت کا آغاز

میں نے مولانا سے بڑے دقیق سوالات کئے، اور اس کا آغاز جیسا کہ مولانا نے بھی حدیث دوستاں میں لکھا ہے۔ براہین قاطعہ مولفہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری کے مطالعہ سے ہوا[71] براہین قاطعہ انوار ساطعہ کے جواب میں لکھی گئی ہے، براہین قاطعہ کی اشاعت کے بعد اس کے جواب

---

[70] - حدیث دوستاں ص ۵۵۳ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ

[71] - حدیث دوستاں ص ۵۰۰ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ

میں "البوارق اللامعۃ علی من اراد اطفاء الانوار الساطعۃ" شائع ہوئی۔ اس سوال وجواب کی کشمکش نے میرے ذہن میں کئی سوالات پیدا کئے اور پھر مولانا سے مراسلت شروع ہوئی، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ نرے سوالات نہیں تھے جو محض ذہن وخیال میں پیدا ہوگئے ہوں، بلکہ کتابوں کے مطالعہ اور افکار و نظریات کی علمی کشمکش نے یہ سوالات پیدا کئے تھے، اس طرح یہ سوالات بھی علم کے نتیجے میں پیدا ہوئے تھے۔

میرے سوال وجواب کا طریقہ–سوال کے ساتھ مجوزہ جواب بھی منسلک کرتا تھا

سوال وجواب کے باب میں میرا طریقہ (جو بلاشبہ مولانا ہی کی تربیت کا فیض تھا) یہ تھا کہ ہر سوال پر پہلے خود غور کرتا تھا، اور اس کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر اس کا جواب سوچتا تھا، اور جب اس کا کوئی جواب مل جاتا تو مولانا کو اپنا سوال اور تجویز کردہ جواب دونوں تحریر کرتا، مولانا کبھی اس کی اصلاح فرماتے اور کبھی تصویب فرماتے اور اگر مزید تشریح کی ضرورت ہوتی تو تشریح فرماتے، سوال کا کوئی اور بہتر جواب ہوتا تو وہ بھی لکھتے، وہ مولانا کے علمی وفور اور فرصت کی فراوانی کا دور تھا، ہر بات پوری تفصیل کے ساتھ لکھتے تھے، اس طرح میرے خطوط میں اکثر سوالوں کے ساتھ جواب بھی منسلک ہوتے تھے، الا یہ کہ مولانا ہی کی کسی عبارت پر کوئی اعتراض ہو، مثلاً:

میرا پہلا خط–میرے مجوزہ جواب کا ایک نمونہ

☆ مولانا کے ساتھ میرے طویل سلسلۂ مراسلت کا آغاز میرے جس خط سے ہوا تھا، وہ خط بھی تفصیلی سوال کے ساتھ اس کے ایک مختصر جواب پر بھی مشتمل تھا، جس کی تصویب کرتے ہوئے مولانا نے اس کی مفصل تشریح فرمائی، میں نے اپنا سوال تفصیل سے لکھنے کے بعد آخر میں بطور جواب یہ چند سطریں لکھی تھیں:

> "اگر واجب کی تقسیم بالذات اور بالغیر اور محال کی تقسیم بالذات اور بالغیر کرکے یہ کہا جائے، کہ واجب بالغیر مثلاً صفات باری تعالیٰ اور محال بالغیر مثلاً ان صفات کا زوال قدرت خداوندی کے احاطہ میں ہے اور اس کا خلف ممکن ہے، اور

قباحت سے خالی ہے، اور واجب بالذات اور محال بالذات تحت قدرت باری تعالیٰ نہیں ہے، اور محال و ممتنع اور واجب کے تحت قدرت نہ ہونے کا مطلب یہی ہے، تو کیا یہ جواب صحیح ہے؟[72]

مولاناؒ نے اس خط کے جواب میں (جو حدیث دوستاں میں میرے نام پہلا خط ہے) میرے اس جواب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"تم نے اپنے خط میں واجب بالذات و بالغیر اور محال بالذات و بالغیر سے جواب کی طرف اشارہ کیا ہے، تمہارا ذہن صحیح پہونچا، لیکن اس کی تشریح مجھ سے سن لو، تاکہ بصیرت حاصل ہو جائے"[73]

پھر مولانا نے پوری تفصیل کے ساتھ اس کی مدلل تشریح قلمبند فرمائی، جو حدیث دوستاں میں تقریباً بارہ (۱۲) صفحات میں پھیلی ہوئی ہے، اور کوئی شبہ نہیں کہ مولانا کی تشریح سے نہ صرف یہ کہ اپنے جواب پر انشراح صدر حاصل ہوا، بلکہ علم کے بہت سے نئے گوشے بھی روشن ہوئے۔

نبوت بالذات اور بالعرض کے مسئلہ پر میرا مجوزہ جواب اور مولانا کی اصلاح

☆اسی طرح ایک بار حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی معرکۃ الاراء کتاب "تحذیر الناس" پڑھنے کے بعد نبوت بالذات اور بالعرض کے مسئلہ پر کچھ شبہات پیدا ہوئے، اور میں نے مولانا کو بڑے سائز کے تین صفحات میں ایک تفصیلی خط لکھا، وہ خط میری ڈائری میں محفوظ ہے، لیکن ڈائری دیمک سے محفوظ نہ رہ سکی، مختلف جگہوں سے دیمک نے چاٹ لیا ہے، بہر حال جو کچھ بھی محفوظ ہے، اس کی روشنی میں لکھتا ہوں۔۔۔۔ میرے اس طویل خط میں دو صفحہ اعتراض پر اور ایک صفحہ اس کے جواب پر مشتمل ہے، جواب والے حصے سے چند اقتباسات بطور نمونہ پیش ہیں:

---

72 - مجموعۂ مکاتیب قلمی ص ۶، ۷ جمع کردہ اختر امام عادل قاسمی، سن تحریر: ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء بمقام دار العلوم دیوبند۔

73 - حدیث دوستاں ص ۵۰۷ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر: مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ

"اس اہم اشکال کا جواب جو میری ناقص فہم میں آتا ہے کہ اوپر کی تمام تقریرات مسلم۔۔۔۔اور یہ بھی صحیح ہے کہ مجاز و بالعرض کسی خاص علاقہ کی وجہ سے ہوتا ہے، اور اس علاقہ کو ختم کر کے مجاز کا انکار بھی درست ہے، لیکن ایک باریک نکتہ یہ ہے کہ بہت سے مجاز اور حقائق کے مابین علاقے تو ایسے ہوتے ہیں، کہ وہی دارومدار ہوتے ہیں، جب وہی دارومدار ٹھہرے تو جب علاقہ ختم ہو سکتا ہے تو ثمرۂ علاقہ بھی ختم ہو سکتا ہے، لیکن بہت سے علاقے ایسے ہوتے ہیں، جو ثمرۂ علاقہ یعنی مجاز کے لئے دارومدار ہونے کے ساتھ ساتھ کسی مالایقبل الانفکاک شی سے تعلق کی بناپر لازم قطعی بھی ہوتے ہیں، اور علاقہ کی اس تقسیم میں عقلی کوئی استحالہ لازم نہیں آتا ہے، اس لئے کہ علاقہ میں کوئی تقیید عقلی نہیں ہے، تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ بعض علاقوں میں لزوم قطعی ہو سکتا ہے، جب علاقہ میں لزوم قطعی ہونا محتمل ہے، کہ یہ بھی ممکن ہے کہ لزوم ہو اور یہ بھی کہ لزوم نہ ہو، تو کوئی جانب متعین نہیں ہے، اب تعیین رخ کے لئے ہم کو کسی معین اور مرجح کی تلاش کرنی ہو گی، اور وہ مرجح اہل اسلام کے لئے ایک تو وقوع واقعہ ہے، اور دوسرا اخبار شریعت اور الامر بالایمان بہ ہے کہ وقوع بتلاتا ہے کہ عدم لزوم نہ تھا بلکہ لزوم قطعی تھا۔۔۔۔۔غرض علاقۂ لازمہ کا انفکاک ذات شے سے باوجود تغایر ذاتی کے لزوم کی وجہ سے ممکن نہیں ہے، تو جب اس علاقۂ لازمہ قطعیہ کا انفصال شے سے ممکن نہیں تو ثمرۂ علاقہ کا انفصال جو اس سے متفرع ہوتا ہے یہ بھی ممکن نہیں ہے۔۔۔۔۔الیٰ آخرہ، یہ ہے میرے ذہن ناقص کی پیداوار۔ جو موافق شرع بھی ہے اور موافق عقل و منطق بھی، لیکن آنحضور سے گذارش ہے کہ ہم جاہلوں، تیرہ درونوں، ذہن نارسار کھنے والوں کا کیا اعتبار؟۔۔الیٰ آخرہ"[74]

---

74 ۔ مجموعۂ مکاتیب قلمی ص ۸۳، ۸۴ جمع کردہ اختر امام عادل قاسمی، سن تحریر: ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء بمقام دارالعلوم دیوبند۔

اس خط میں میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ:" کہیں حضرت کو میرے بار بار سوال کرنے سے گرانی نہ ہوتی ہو" حضرت مولانا نے اس خط کا جواب دیا اور میرے مجوزہ جواب کی اصلاح فرمائی، مولانا کا خط یہ ہے:

"عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارے خط کا مجھے انتظار تھا، اور تاخیر میرے اوپر گراں گذر رہی تھی، پھر یہ سوچ کر صبر کر لیا تھا، کہ ابھی مدرسہ پہونچے ہوگے، طبیعت یکسو نہ ہوئی ہوگی، اس لئے دیر ہو رہی ہے۔

تمہارے سوال سے مجھے الجھن ہونا کیا معنیٰ خوشی ہوتی ہے، تمہیں سوالات کی بے تکلف اجازت ہے، ان شاء اللہ بساط بھر جواب دینے کی کوشش کروں گا، یہ کارڈ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ غازی پور کے ترک کا قلب ودماغ پر اتنا شدید اثر ہے، کہ ابھی تک اس نئی جگہ یکسوئی، فراغت قلبی اور انضباط اوقات کی صورت نہیں بن سکی ہے، اس لئے تفصیلی جواب میں کچھ تاخیر ہوگی، تمہارے انتظار کو رفع کرنے کے لئے یہ اطلاعی کارڈ لکھ رہا ہوں، ان شاء اللہ کوشش کر کے جلد ہی خط لکھوں گا، ہو سکتا ہے دس پانچ دن لگ جائیں، ویسے اتنا بتادوں کہ مابالذات پر حقیقت اور مابالعرض پر مجاز کا اطلاق نہیں ہوتا، دونوں حقیقت ہی ہوتے ہیں، حقیقت ومجاز کی حقیقت کچھ اور ہے، بالذات وبالعرض سے ان کا کچھ تعلق نہیں ہے، اسی کی تفصیل بعد میں لکھوں گا، اور اگر میرے اشارے کو تم سمجھ گئے ہو، تو خود ہی غور کر کے تفصیل مرتب کر لو، اور میرے پاس بھیج دو، اتنا اور بتادوں کہ جس لفظ پر مجاز کا اطلاق ہوتا ہے، اس کے مدلول میں حقیقت کا کوئی شائبہ موجود نہیں ہوتا، حقیقت سے محض ایک علاقہ حاصل ہوتا ہے، اور اس کے برخلاف مابالعرض میں بعینہ وہی چیز ہوتی ہے، جو مابالذات میں ہوتی ہے، اس لئے اس پر مجاز کا اطلاق

کیوں کر درست ہو گا، اب شاید سمجھ گئے ہو گے۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی (۳۰/ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ)[75]

چنانچہ میں نے مولانا کے بتائے ہوئے اشارات کی روشنی میں ایک تفصیلی تحریر مرتب کی اور مولانا کو بھیج دی، مولانا نے اس کے جواب میں جو خط لکھا وہ مولانا کے وصال کے بعد شائع شدہ مجموعۂ مکاتیب "اعجاز نامے" میں چھپ چکا ہے، مولانا نے لکھا کہ:

"تمہارا خط ملا، الحمد اللہ تم نے بات سمجھنے کی کوشش کی، اور ایک حد تک اس میں کامیاب رہے، اب اس کی مزید شرح مجھ سے سن لو" (باقی پورا جواب کتاب میں موجود ہے)[76]

خلاصۂ جواب لکھنے کا معمول

اسی طرح میرا ایک معمول یہ بھی تھا کہ جب مولانا کا جواب موصول ہوتا۔ تو بغور مطالعہ کرنے کے بعد جو حاصل جواب ہوتا وہ بھی میں مولانا کو اختصار کے ساتھ لکھ کر بھیجتا تھا، اس سے میرے فہم کی توثیق ہوتی تھی، اور مولانا کو خوشی ہوتی تھی کہ اس نے بات سمجھ لی، آج جب کہ یہ چیزیں قصۂ پارینہ ہو چکی ہیں اور میرے دل کے جذبات واحساسات کو سمجھنے والا قبر میں جا کر لیٹ چکا ہے، لیکن اپنے عہد رفتہ کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ ایک نمونہ اس کا بھی پیش کر دوں، اس سے مولانا کی شخصیت کی عظمت، طریقۂ تربیت اور جوابات کی معنویت کا اندازہ ہو گا، اور تفصیل کی تلخیص بھی سامنے آجائے گی، مولانا کا پہلا مکتوب (میرے نام حدیث دوستاں میں) جو امکان کذب سے متعلق ہے موصول ہوا تو اس حقیر نے اس مکتوب پر تفصیلی عریضہ لکھا، جو بڑے سائز کے قریب پانچ (۵) صفحات پر مشتمل تھا، اس کا پہلا آدھا صفحہ مولانا کے مفصل مکتوب (۱۸ صفحات) کا خلاصہ ہے، اس کا ایک

---

75 - مجموعۂ مکاتیب قلمی ص ۸۴، ۸۵ جمع کردہ اختر امام عادل قاسمی، سن تحریر: ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء بمقام دار العلوم دیوبند۔ (نوٹ) مولانا کا یہ خط اب تک غیر مطبوعہ ہے اس لئے یہاں پورا خط نقل کر دیا گیا، یہ میرے مجموعۂ مکاتیب میں محفوظ ہے۔

76 - اعجاز نامے ص ۱۳۶ تلاش وتدوین: محمد عرفات اعجاز اعظمی، ناشر: مکتبہ ضیاء الکتب، مئو، ۲۰۱۹ء

اقتباس ملاحظہ ہو:

"ایسی ایسی تقسیمات جن سے عقدات لاتنحل کھلتے چلے جائیں، کہیں حمل کی چار صورتوں کی تخریج، موضوع و محمول کے درمیان علاقۂ عینیت یا جزئیت یا لزوم ماہیت، یا علاقۂ عرض مفارق، اور پھر اول الذکر تین انواع کو واجب بالذات اور ان کے نقائض کو ممتنع بالذات قرار دینا اور آخر الذکر علاقۂ عرض مفارق کی صورت کو واجب بالغیر اور اس کی نقیض کو ممتنع بالغیر قرار دینا، اور بالذاتیات کو غیر مقدور باری تعالیٰ اور بالغیر کو مقدور باری تعالیٰ ہونے کے ایسے باریک دلائل پیش کرنا کہ صاحب ذوق آدمی اچھل ہی تو جائے۔

پھر صفات کی تین تقسیمیں: حقیقیہ محضہ، حقیقیہ اضافیہ اور اضافیہ محضہ، پھر بڑی خوش اسلوبی سے حقیقیہ محضہ کو محض ذات باری سے متعلق اور حقیقیہ اضافیہ کی دو جہتیں باعتبار مبدأ اور باعتبار تحقق و وجود یا باعتبار تعقل اور باعتبار ترتب آثار قائم کرنا، اور ایک کو صفت قدیمہ اور دوسرے کو حادث قرار دینا، اور اضافیہ محضہ کو متعلق بالغیر اور بری من الذات کرنا، پھر قدرت کی دو تقسیمیں ایک حقیقیہ باعتبار اقتران بالفعل، دوسرے حقیقیہ باعتبار استعداد و صلاحیت، جو بمقابلۂ عجز ہے، اور قدرت سے مراد قدرت بالمعنی الثانی لینا، اور قدرت بالمعنی الاول نہ لینا، چند خرابیوں کی بنا پر کہ ورنہ صفت قدیمہ قدیمہ نہ رہے گی، اس لئے کہ اس کے لئے اقتران بالفعل ضروری ہے، تو ظاہر ہے کہ مقدورات حادث ہیں، تو قدرت کا وجود بھی اسی وقت ہوا، تو قدرت باری حادث ہوئی نعوذ باللہ من ذلک، یا تمام مقدورات باری کو قدیم ماننا پڑے گا اس لئے کہ قدرت ازلی ہے، تو ان کا وجود بھی ازلی ہے پس یہ قدیم ہوگی نہ کہ حادث، ولیس کذلک۔ پھر کلام کی تقسیم نفسی و لفظی، اور نفسی کو بسیط اور غیر محتمل صدق و کذب و خبر و انشاء قرار دینا، اور

لفظی کو مرکب اور محتمل صدق وکذب وخبر انشاء قرار دینا اور صدق وکذب کو صفت لفظی قرار دینا، پھر قدرت کے ذیل میں صدق وکذب کو بھی مقدور باری تعالی بتانا وغیرہ وغیرہ یہ سب وہ انوکھے دلائل ہیں جن میں لامحالہ وجد کا کیف مل ہی جاتا ہے"[77]

اس کے جواب میں مولانا نے مسرت کے ساتھ لکھا کہ:

"بہت خوشی ہوئی کہ تم نے خط کے مضامین سمجھ لئے، مجھے آں عزیز سے یہی توقع تھی، اور اسی لئے قدرے بسط سے میں نے کام لیا تھا[78].

ایک بار لکھا کہ:

"اشکالات سے خوشی ہوئی کہ تلاش وتحقیق کا مادہ الحمد اللہ کہ بدرجۂ اطمینان تمہارے اندر ہے۔ البتہ میرے خط کے مندرجات پر غور کم کیا ہے۔ اگر ذرا صبر و تامل سے اپنے اشکالات کو ذہن میں رکھ کر میرا خط بار بار پڑھتے تو جواب کے اشارات تمہیں مل جاتے[79]

انکار صفات باری کے مضرات پر میری پیشگی جواب آرائی

ایک بار مولانا کا تفصیلی مکتوب موصول ہوا، جس میں آپ نے معتزلہ کا منکر صفات ہونا ثابت کیا تھا، اور لکھا تھا کہ آئندہ کسی موقعہ پر انکار صفات کے نتائج بد پر روشنی ڈالوں گا، میں نے اپنے عریضہ میں مولانا کے اس مکتوب کی تلخیص کے ساتھ انکار صفات کے متوقعہ نتائج بد پر بھی (مولانا کی تحریر آنے سے قبل ہی) قیاس آرائی کر دی، اور تقریباً چار (۴) صفحات سیاہ کر ڈالے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"ایک بڑی خرابی میری سمجھ اور ناقص بہت ناقص فہم میں یہ آتی ہے جس کی

---

77 - مجموعۂ مکاتیب قلمی ص ۱۷، ۱۸ جمع کردہ اختر امام عادل قاسمی، سن تحریر: ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء بمقام دار العلوم دیوبند۔

78 - حدیث دوستاں ص ۵۱۹ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر: مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ

79 - حدیث دوستاں ص ۵۳۱ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر: مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ

طرف شرح عقائد میں بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ فلاسفہ کے نزدیک صفات باری تعالیٰ کوئی چیز نہیں ، جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو اہل التوحید کہتے ہیں ، تو دوسری طرف ان کے یہاں عدل حق باری تعالیٰ کے لئے واجب ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو اہل العدل بھی کہتے ہیں، یہ دونوں عقیدے ان کے یہاں مسلم اور طے شدہ ہیں ، لیکن اہل باطل کے کلام میں جہاں اختلاف اور تعارض ہوتا ہے، وہیں ان کے عقائد یہاں تک کہ مسلمہ عقائد میں بھی غیر شعوری اور اضطراری طور پر تعارض اور اختلاف ہو ہی جاتا ہے، اور آیت کریمہ ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً" کی حقانیت نصف النہار کی طرح نمایاں اور مجلیٰ ہو جاتی ہے، اس لئے کہ عدل کا مطلب یہ ہے کہ حق باری تعالیٰ پر تنعیم مطیع اور تعذیب عاصی واجب ہے، اور اہل التوحید ہونے کا ان کے یہاں مطلب یہ ہے کہ وہ تمام صفات کملہ سے عاری وخالی ہے، دونوں عقیدوں کا تعارض واضح اور ظاہر ہے اس لئے کہ جب باری تعالیٰ تمام اوصاف کمال سے خالی ہے اور کوئی صفت ان کے اندر نہیں ہے، تو آمر وناہی ہونا بھی تو ایک صفت کمال ہی ہے، گویا اللہ تعالیٰ صفت امر و نہی سے بھی خالی ومنزہ ہے، اور عدل کا سارا دارومدار صفت امر و نہی پر ہے، اس لئے کہ عدل کے لئے دونوں نوع کا ہونا رکن اعظم ہے، ایک اطاعت اور دوسرے عصیان ، اطاعت شعاروں کی جزاء تنعیم ہے، اور عصیان کاروں کی سزا تعذیب ہے، اور اطاعت و عصیان کے لئے امر و نہی لازم وضروری ہے،۔۔۔۔ تو جب امر و نہی کا فقدان ہے تو اطاعت وعصیان کا وجدان کہاں سے ہو گا ،۔۔۔ دوسری طرف وہ افعال عباد کو مخلوق باری تعالیٰ نہیں قرار دیتے ہیں بلکہ اپنے افعال کا خالق خود بندوں کو قرار دیتے ہیں ، تو لامحدود خالقین اور شرکاء فی الخلق پیدا ہو گئے، اور بندوں

کو اپنے افعال کا خالق قرار دینے کی وجہ وہی عدل کا تقاضا ہے، کہ ورنہ بندہ مجبور محض ہو گا اور جزاء وسزا کا ترتب بے محل اور بے جا ہو گا، تو اگر عدل کو پکڑا تو توحید گئی ،اور توحید کو پکڑا تو اور تمام صفات کا انکار کیا تو عدل فنا کے گھاٹ اتر گیا ،غرض ان دونوں مسلمہ عقیدوں کے درمیان تعارض اور سخت تعارض ہے[80]

مولانا نے میرے اس خط کا جواب ان الفاظ میں تحریر فرمایا (یہ خط بھی اب تک کسی کتاب میں شائع نہیں ہوا اس لئے پورا خط نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ محفوظ ہو جائے):

"محبی وعزیزی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارے خط کا مجھے انتظار تھا، الحمد اللہ آج انتظار اپنی تکمیل کو پہونچا، مسئلۂ صفات پر جو کچھ مزید لکھنا ہے، اس کے لئے وقت درکار ہے، اس لئے بطور رسید کے یہ خط ابھی بھیج رہا ہوں، آج دوشنبہ ہے اگر جمعرات کو فرصت میسر آئی، تو قلم کاغذ بہم کرنے کی کوشش کروں گا، میری فرصت کے انتظار میں تم خط کا بھیجنا موقوف ہرگز نہ کرو، میں اس قلبی رابطہ کی وجہ سے جو تمہارے ساتھ ہے، ہر خط کے بعد دوسرے خط کا انتظار کرتا ہوں ،اگر مفصل لکھنے کا موقعہ ہوا تو مفصل ورنہ مختصر جواب ضرور دوں گا، تم سے کوئی تکلف تو ہے نہیں کہ ہر خط کے تفصیلی جواب دینے کی مجبوری ہو، لیکن لکھنا بند مت کرو، اگر تم لوگ لکھنا بند کر دوگے تو پھر میرا قلم بھی سویا ہی رہے گا۔۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ کے متعلق جو بات تم نے لکھی ہے وہ بالکل صحیح ہے ، اکابر کا فیضان ان کے وصال کے بعد بھی جاری رہتا ہے، ہم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں ،اور جو کچھ دین کی اور علم کی خدمت بن پڑتی ہے وہ انہی

---

80 - مجموعۂ مکاتیب قلمی ص ۵۶ جمع کردہ اختر امام عادل قاسمی، سن تحریر: ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء بمقام دار العلوم دیوبند۔ یہ خط ۲۳ / جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ کو لکھا گیا۔

حضرات کی برکت ہے، انہی بزرگوں کی باتیں ہیں جو ہم اس زمانہ کی زبان میں سجا کر پیش کرتے ہیں۔

الحمد اللہ کہ میری تحریر تم نے سمجھ لی ہے، خدا کا شکر ہے، حق تعالیٰ تمہیں علم نافع ، عمل صالح ،اور فہم سلیم مزید عنایت فرمائیں ،امتحان کے نمبرات سے بہت مسرت ہوئی، حق تعالیٰ علم کا نفع تمہیں بخشیں، جن دوستوں کا سلام تم نے لکھا ہے انہیں میرا بھی سلام کہہ دو اور یہ کہ سب کے لئے دعائیں کرتا ہوں اور روزانہ کرتا ہوں، الحمد اللہ یہاں سب خیریت ہے۔

اعجاز احمد اعظمی (۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ)[81]

مگر انکار صفات کے مضرات پر میں نے جو جواب آرائی کی تھی اس کا تذکرہ اس خط میں نہیں ہے، تو میں نے اگلے خط میں اپنے مذکورہ بالا جواب کے بارے میں مولانا کو ان الفاظ میں یاد دہانی کرائی:

"میں نے جو انکار صفات کی خرابی تحریر کی ہے، شاید وہ قبول خاطر نہ ہوا، اسی وجہ سے اس کا تذکرہ مکتوب کے کسی ایک آدھ جملہ میں بھی نہیں ملتا، محسوس تو یوں ہی ہوتا ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ میرے ناقص احساس کی خطا ہو، اور کسی اور وجہ سے اثبات صفات کے ذیل میں اس کی طرف اشارہ کو بھی ممنوع قرار دیا گیا ہو، تاکہ جب مضرات کی بحث چھڑے تو اس کڑی کی دلچسپی سے ساری باتیں کی جا سکیں "(نیز انکار صفات کے مضرات پر خود روشنی ڈالنے کی بھی درخواست کی تھی ،علاوہ اور باتیں بھی تھیں)[82]

مولانا نے اس کے جواب میں ۱۲/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۶ھ کو مجھے تحریر فرمایا (یہ خط بھی اب

---

81 - مجموعۂ مکاتیب قلمی ص۵۸ جمع کردہ اختر امام عادل قاسمی، سن تحریر: ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء بمقام دار العلوم دیوبند۔ یہ خط ۲۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ کو لکھا گیا۔

82 - مجموعۂ مکاتیب قلمی ص۶۸ جمع کردہ اختر امام عادل قاسمی، سن تحریر: ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء بمقام دار العلوم دیوبند

تک کسی مجموعہ میں شائع نہیں ہوا ہے، اس لئے اس کو بھی مکمل نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے):

"عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج سنیچر کو تمہارا خط ملا، اب تمہیں مزید انتظار کرنا ہوگا، لکھنے کا ارادہ ہے، ان شاء اللہ لکھوں گا، تم نے جو سابقہ خط میں انکار صفات پر لکھا تھا، اس سے عدم اتفاق نہیں ہے، البتہ اس میں تفصیل کی ضرورت ہے، اس کو میں نے ترتیب کے لحاظ سے بعد میں رکھا ہے، اسی لئے اس پر کچھ کلام نہیں کیا، اب اس کی نوبت آئے گی ۔۔۔ جدید علم کلام کی ضرورت بیشک ہے لیکن اس کے لئے سائنس کو مس کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ علم عقائد کا موضوع اثبات مغیبات ہے اور سائنس کا موضوع ہے تحلیل محسوسات ومشاہدات، ظاہر ہے کہ جہاں سائنس خاموش ہوتی ہے وہاں سے علم عقائد کی گفتگو شروع ہوتی ہے، اس لئے وہ تو نہیں، ہاں تمہارا مطلب شاید یہ ہو کہ آج کی دنیا میں جو مسلمات وبدیہیات ہیں ان کی روشنی میں اور انھیں کی اصطلاحوں میں عقائد پر گفتگو ہونی چاہئے تو یہ ٹھیک ہے، لیکن اس کے لئے سائنس کو اپنے علم کے طور پر قبول کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جو لوگ سائنس کی راہ سے گمراہ ہوئے ہیں، درحقیقت ان کی کوتاہ نظری ہے، سائنس تو مؤید ہے دین ومذہب کی، اس کی شرح خود ایک مفصل بحث ہے، پھر کبھی دیکھا جائے گا۔

رضوان کے بارے میں تم نے بھی لکھا، اور اس سے پہلے تمہارے والد محترم نے بھی لکھا تھا، میں بہت شرمندہ ہوں واقعۃً بالاستقلال وقت نکالنا بحالت موجودہ بہت ہی دشوار ہے، کئی ایسے کام ہیں، کہ مستقل وقت کے طالب ہیں، اور میں ان سے بھی شرمندہ ہوں، کیا کروں، مدرسہ کی ضروری مشغولیت کم کرنے پر قادر نہیں، اور وقت کو بڑھا نہیں سکتا، اس لئے بہت مجبور ہوں، ویسے رضوان سلمہ

سے امید ہے کہ اس کے بغیر بھی وہ کامیاب رہے گا، جن بچوں نے مجھے سلام لکھوایا ہے ان سے میرا سلام بھی کہدو۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی (۱۲/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۶ھ)[83]

چنانچہ اس کے چند روز کے بعد ہی ۱۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۰۶ھ کو آپ نے انکار صفات کے مضرات پر جو مستقل مکتوب (حدیث دوستاں میں میرے نام کا آخری خط) تحریر فرمایا اس میں یہ پورا مضمون سما گیا ہے، اور اس کو مولانا نے پوری تفصیل و تحلیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے، اس سے میرے مذکورہ جواب کی توثیق ہوئی، فالحمد اللہ علیٰ ذلک۔

اپنے دور میں فن معقولات کے امام

بہر حال اس طویل پس منظر سے ایک طرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح مولانا اپنے طلبہ کو علمی کاموں پر لگاتے تھے، اور خود بھی ہر وقت اس کے لئے تیار رہتے تھے، اور ہم لوگ کتنی تیاریوں کے بعد آپ سے مراسلت کرتے تھے، دوسری طرف کلامی اور فلسفیانہ مسائل میں مولانا کے درک و معرفت اور مجتہدانہ بصیرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔۔۔ گو کہ مولانا نے ان علوم سے اپنا دامن جھاڑ کر تصوف اور علوم منقولہ کو اپنا موضوع بنالیا تھا، لیکن عقلیات میں آپ کی بصیرت کم نہیں ہوئی، میں نے عقلیات (بشمول کلامیات وعلوم قاسمیہ) میں اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ آپ ہی سے استفادہ کیا، اور آپ کو اپنے عہد میں اس فن کا امام پایا، قدرت کی طرف سے غضب کا حافظہ اور اخاذ ذہن و دماغ ملا تھا، بات کی تہ تک پہونچنا ان کے لئے کچھ مشکل نہ ہوتا تھا، ہر مسئلہ کی لمیات سے بحث کرتے تھے، اور چاہتے تھے کہ اس کے آخری نتیجہ تک پہونچ جائیں، گو کہ میری مراسلت محض چند عقلی جزئیات پر ہوئی اور حدیث دوستاں میں مطبوعہ علمی مکاتیب صرف چند مسائل (امکان کذب، خلف وعید، صفات باری وغیرہ) سے بحث کرتے ہیں، لیکن ان میں بھی آپ کی امتیازی اور اجتہادی شان کی جھلک پوری نظر آتی ہے، اس کے لئے چند مثالیں پیش کرتا ہوں، جن سے مولانا کی عبقریت اور انفرادیت کا اندازہ ہوگا:

---

83 - مجموعۂ مکاتیب قلمی ص ۶۹ جمع کردہ اختر امام عادل قاسمی، سن تحریر: ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء بمقام دار العلوم دیوبند

امکان کذب کے مسئلہ کو خلف وعید سے اصلاً کوئی تعلق نہیں

☆عام طور پر متکلمین کے یہاں امکان کذب کے مسئلہ کو خلف فی الوعید کی فرع قرار دیا جاتا ہے، حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ کی کتاب البراہین القاطعۃ میں بھی یہی روایتی تصور موجود ہے، لیکن ہمارے مولاناؒ نے خلف فی الوعید کی ایسی تشریح فرمائی کہ اس کا امکان کذب کے مسئلہ سے کوئی تعلق ہی نہ رہا، مولانا نے متقدمین کی عبارتوں کی روشنی میں ثابت کیا کہ خلف فی الوعید جس کے امکان بلکہ وقوع کو بھی اہل سنت والجماعت تسلیم کرتے ہیں، اس کا امکان کذب سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے، خلف وعید دراصل کرم وبخشش ہے، اس کو قدرت کذب سے کیا ناطہ ؟ آپ نے مسئلہ کی ایسی تعبیر و تشریح اختیار کی جو قرآن وحدیث سے زیادہ قریب اور کذب وایہام سے بعید تر ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ خلف فی الوعید کا سراغ قدماء کی عبارتوں میں ملتا ہے، اوران کے درمیان نزاع بھی واقع ہوئی ہے، لیکن نزاع محض لفظی ہے، میں نے جب اس پر غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ یہ سرے سے کوئی نزاع ہی نہیں ہے، اس لئے یہ تعبیر بدل دینی چاہئے، تاکہ نزاع لفظی اور اختلاف صوری بھی اٹھ جائے ،اوراصل حقیقت سامنے آجائے۔

حقیقت یہ ہے کہ وعیدات عامہ کا مطلب ہی یہ ہے کہ انہیں اشخاص سے متعلق نہ کیا جائے، بلکہ صرف بیان خاصیات پر محمول کیا جائے۔۔۔ غرض میری تعبیر و تشریح نے خلف فی الوعید کا لفظ ہی درمیان سے اٹھادیا، جس کی بنیاد پر نزاع کا امکان تھا، اوراسے ختم ہونا ہی بہتر ہے، کہ خواہ مخواہ ایک غلط بات کا ایہام ہوتا ہے، اور ہر ایسے لفظ سے احتیاط کرنی چاہئے جو موہم غلط ہو، اسی طرح امکان کذب کے لفظ سے بھی پرہیز کرنا ہی بہتر ہے، کیونکہ امکان کے معنٰی جہاں تحت القدرۃ ہونا ہے وہیں امکان کا معنٰی یہ بھی ہے کہ کسی شے کی نفی ضروری نہ ہو، اور اس کا وجود محال نہ ہو، بلکہ یہ دوسرا معنٰی ہی زیادہ عام فہم ہے اوراس سے خواہ مخواہ

باری تعالیٰ کے کلام میں احتمال کذب پیدا ہوتا ہے، ہاں اگر یہ کہا جائے کہ صدق و کذب دونوں تحت القدرۃ ہیں، تو عنوان کی وحشت ناکی ختم ہو جاتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اب براہین قاطعہ اور میری عبارت میں تعارض کا جو شبہ واقع ہوا تھا وہ دور ہو گیا ہو گا، مطلب یہ ہے کہ گو مولانا خلیل احمد صاحب کی عبارت سے ایسا مفہوم ہوتا ہے کہ وہ خلف فی الوعید کو بھی تسلیم کرتے ہیں، اور اس کی فرعیت میں امکان کذب کو بھی لاتے ہیں، اس کے برخلاف بندہ کی تشریح کے مطابق اولاً تو خلف فی الوعید کا ثبوت ہی نہیں اور اگر ہو تو امکان کذب کا مسئلہ اس کی فرع نہیں ہے، بظاہر ان دونوں باتوں میں تعارض ہے لیکن میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ نظر بظاہر اشاعرہ خلف فی الوعید مانتے ہیں، اور پھر گو کہ اسے کرم اور بخشش کا نام دے کر کذب سے یکسو کرتے ہیں، لیکن کہنے والا کہہ سکتا ہے، کہ خواہ بخشش و کرم ہو لیکن ہے خلاف خبر، اس لئے اسے کذب ہی کہیں گے، مستقبح نہ سہی کذب مستحسن سہی، لیکن نفس کذب کا صدق تو اس پر ہوا، اس اعتبار سے امکان کذب خلف فی الوعید کی فرع قرار پاتا ہے، لیکن یہ سب بظاہر نظر ہے، اصل حقیقت کی تنقیح کے بعد یہ دونوں باتیں ھباء منثوراً ہو جاتی ہے، مولانا کا موضوع اس موقعہ پر تنقیح حقیقت نہیں ہے، بلکہ سرسری طور پر اس کا ذکر فرمایا ہے، اس لئے نظر بظاہر جو کچھ تھا اس کی طرف محض اشارہ کر دیا، اس طرح تعارض دفع کر لو، اور اگر اب بھی دفع نہ ہو تو یوں سمجھ لو کہ معتزلہ نے خلف فی الوعید کا انکار امکان کذب ہی کی بنیاد پر کیا تھا، اس لئے ہمارے لوگوں نے بھی تسامحاً اس کو اسی کے ساتھ جوڑ دیا، ورنہ یہ حقیقت نہیں ہے[84]۔

دراصل میں نے مولانا کی خدمت میں اس تعارض کا ذکر کیا تھا کہ:

---

[84] - حدیث دوستاں ص ۵۲۵، ۵۲۶ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی۔

"بظاہر دونوں عبارتوں میں تعارض معلوم ہو رہا ہے، اس لئے کہ آپ کی عبارت اس کی طرف مشیر ہے کہ خلف فی الوعید میں امکان کذب داخل تو کیا اس کا شائبہ بھی اس میں نہیں ہے، لیکن براہین قاطعہ کی عبارت میں تصریح ہے کہ امکان کذب خلف وعید کی فرع اور اس کا ایک جزء ہے، فما التطبیق بین ھاتین العبارتین المتضادتین؟[85]

اسی کے جواب میں مولانا کی مذکورہ بالا تشریح و تطبیق منصۂ تحریر پر آئی۔

خلف وعید کی تشریح مولانا کے فکر واجتہاد پر مبنی

واضح رہے کہ خلف وعید کی جو تشریح مولانا نے کی تھی وہ کسی کتاب کے مطالعہ پر نہیں بلکہ ان کے فکر واجتہاد پر مبنی تھی، خود لکھتے ہیں:

"وعید کی جو تشریح میں نے کی ہے وہ کسی کتاب میں نظر سے نہیں گذری، حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ کے بعض مواعظ میں اور قرآن وحدیث کے بعض الفاظ کی تفسیر وشرح کے ذیل میں اس کی جانب اشارہ موجود ہے، اگر تم چاہو گے تو بعد میں ان اشاروں کی تفصیل بتاؤں گا"[86]

ایک دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"حقیقۃ الامر کے لحاظ سے خلف فی الوعید کا مسئلہ ہمارا نہیں ہے، معتزلہ کے یہاں سے نقل ہو کر برائے جواب آیا ہے، گویا جو کچھ کتب کلام میں منقول ہے وہ علیٰ سبیل التسلیم ہے، اور جو کچھ بندہ نے لکھا ہے وہ علیٰ سبیل التحقیق ہے اور مآل دونوں کا احقاق حق ہے، اگر قدماء نے کوئی دلیل کسی مسئلہ کی یا تفصیل ذکر نہ کی ہو تو کیا بعد والوں کو اس کی اجازت نہ ہوگی؟ پھر یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ کسی نے

---

85 - مجموعۂ مکاتیب قلمی ص ۱۹ جمع کردہ اختر امام عادل قاسمی، سن تحریر: ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء بمقام دار العلوم دیوبند

86 - حدیث دوستاں ص ۵۱۹ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر: مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ

یہ تحقیق نہیں لکھی، ہماری تمہاری نظر کتب عقائد پر کتنی ہے ہی"[87]

اس سے کلامیات اور معقولات میں مولانا کی فکری اور اجتہادی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، اور عقلیات کو کس طرح آپ نے علوم منصوصہ کے مزاج و مذاق کے تابع کر دیا تھا، اس کا بھی پتہ چلتا ہے، یہ آپ کے جامع العلوم ہونے کی علامت ہے۔

معتزلہ صفات باری تعالیٰ کے قائل نہیں تھے۔مولانا کی تحقیق

☆اسی طرح ایک قدیم مسئلہ یہ ہے (جواب افسانۂ ماضی بن چکا ہے) کہ معتزلہ صفات باری تعالیٰ کے قائل تھے یا منکر؟ عام طور پر کتابوں کی تصریحات سے یہ صاف معلوم نہیں ہوتا کہ وہ صفات کے کلیتاً منکر تھے، میرا خیال تھا کہ وہ صفات کے منکر نہیں تھے، البتہ تعبیر میں اختلاف تھا، لیکن مولانا نے دلائل سے ثابت کیا کہ معتزلہ جس طرز فکر کے حامل ہیں، اس کا مآل انکار صفات کے علاوہ دوسرا ہو ہی نہیں سکتا، جب میرے نام ایک مکتوب میں پہلی بار مولانا کا یہ دعویٰ سامنے آیا تو میں نے ان کو لکھا کہ:

> "آپ نے فرمایا کہ " معتزلہ منکر صفات ہیں، وہ باری تعالیٰ کے لئے محض افعال ثابت کرتے ہیں، لہٰذا ان کے اصول کے لحاظ سے مقدور ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ درجۂ فعلیت میں ہو"۔۔۔۔۔لیکن یہ بات اس حد تک تو صحیح ہے کہ اہل سنت کی طرح وہ صفات کے قائل نہیں ہیں، لیکن وہ مطلقاً صفات کے منکر نہیں ہیں، بلکہ وہ بھی صفات باری تعالیٰ کے قائل ہیں، اور بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جب قرآن وحدیث کی نصوص صریحہ سے صفات باری تعالیٰ کا اثبات ہوتا ہے، پھر معتزلہ باوجود ادعائے مسلمانیت کس طرح برسرعام صفات باری تعالیٰ کا انکار کرسکتے ہیں، ہاں! وہ یہ کہتے ہیں کہ صفات باری عین ذات باری ہیں، ذات کے مغائر نہیں ہیں البتہ معلومات سے تعلق کی بنا پر عالم اور مقدورات سے تعلق کی بنا پر قادر کا نام اس پر چسپاں ہوتا ہے، تو یہ تعلقات غیر تو ضرور مغائر ذات ہیں، لیکن

---

87 - حدیث دوستاں ص ۵۳۱ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر: مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ

خود صفات عین ذات ہیں، ورنہ تعدد قدماء، پھر تعدد واجبات، اور پھر تعدد الٰہ لازم آئے گا، جو بدیہی البطلان ہے، جیسا کہ شرح عقائد میں صفات کی بحث میں مذکور ہے:

"وکذاجمیع الصفات فانکرہ الفلاسفۃ والمعتزلۃ وزعموا ان صفاتہ عین ذاتہ لمعنی ان ذاتہ یسمی باعتبار التعلق بالمعلومات عالماًوبالمقدورات قادراًالیٰ غیرذلک ،فلایلزم تکثر فی الذات ولاتعددفی القدماء والواجبات"

اس عبارت اوراہل سنت کے اس اقرار کے ہوتے ہوئے ان پر انکار صفات کا الزام کیوں کر درست ہے؟[88]

مولانا نے اس موضوع پر میرے استفسارات کی روشنی میں چار خطوط لکھے، ایک مختصر اور تین مفصل، اوراس مسئلہ کو پوری طرح منقح کر دیا، ان میں سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"معتزلہ صفات باری تعالیٰ کے منکر ہیں یا معترف؟ تم نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ بھی صفات کے معترف ہیں ،اختلاف جو کچھ ہے وہ تعبیر و تشریح کا ہے، لیکن میرے خیال میں وہ صفات کے سرے سے منکر ہیں، چنانچہ علم کلام کی کتابوں میں یہی مذکور ہے، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے اوراس کا تم نے ذکر بھی کیا ہے کہ قرآن وحدیث میں تو بہت وضاحت کے ساتھ حق تعالیٰ کے لئے صفات کا اثبات ہے، پھر اس کے انکار کی گنجائش انہیں کیونکر ملی؟۔۔۔(پھر ایک طویل تقریر کے بعد)

معتزلہ نے دیکھا کہ فلاسفہ تمام صفات کے یکسر منکر ہیں اور قرآن وحدیث کی نصوص صراحۃً صفات پر دلالت کرتی ہیں، اب یا تو فلاسفہ کے خیمہ میں جائیں، یا اسلام کے دامن میں پناہ لیں، انہوں نے دونوں سے اپنا رشتہ برقرار رکھنا چاہا،

88 - مجموعۂ مکاتیب قلمی ص ۳۶، ۳۷ جمع کردہ اختر امام عادل قاسمی، سن تحریر: ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء بمقام دار العلوم دیوبند

اس کے لئے انہوں نے یہ راہ اختیار کی کہ نہ تو حق تعالیٰ کے لئے صفات کا اثبات کیا، اور نہ فلاسفہ کی طرح خدا کو معطل مانا، بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک اور چیز ثابت کی اور اس کا نام "حال" رکھا، ان کے خیال میں اگر صفات کو ثابت کیا گیا تو تعدد قدماء لازم آئے گا اور اس سے توحید میں خلل پڑے گا، جس طرح فلاسفہ ایک خیالی توحید کے بانی ہیں، اسی طرح معتزلہ بھی ایک خیالی توحید پر نازاں ہیں، (پھر شرح مواقف سے معتزلہ کے دلائل اور ان کا جائزہ نقل کرنے کے بعد)۔۔۔ سوچو، کیا معتزلہ صفات کے معترف ہیں؟ جس چیز کے وہ معترف ہیں وہ دوسری چیز ہے، ہاں اگر ہم بطور الزام - یعنی جو کچھ ان کے دلائل سے لازم آتا ہے ان سے - انہیں صفات کا قائل کہہ دیں تو ممکن ہے، لیکن ھم للکفر اقرب منہم للایمان، وہ مثبت صفات سے بعید اور منکر صفات یعنی فلاسفہ کے بہت قریب ہیں، وہ اپنی زبان سے خود کو معترف صفات کہنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہیں، اسی لئے وہ اہل حق کو طنزاً "صفاتیہ" کہتے ہیں، اور خود کو اہل التوحید کہتے ہیں[89]۔

علم کلام کا موضوع تردید ضلالت ہے تشریح عقائد نہیں—مولانا کا ایک خاص نکتہ

☆مولانا کے مکاتیب میں ایک اور خاص نکتہ جو ان کے گہرے علم و تفکر کا نتیجہ ہے، جس کا ذکر شاید دوسری جگہوں پر نہ ملے، یہ ہے کہ علم کلام کا موضوع کیا ہے؟ عام طور پر اس کا موضوع تشریح عقائد بتایا جاتا ہے، مولانا کو اس سے اختلاف تھا، مولانا فرماتے تھے کہ اس کا موضوع صرف ابطال باطل ہے، عقائد کی تشریح و تعبیر براہ راست قرآن وحدیث کی زبان میں ہونا چاہئے، اس کی تفصیل و توجیہ خود مولانا کے قلم سے پڑھئے (کچھ اقتباسات):

"(فلاسفہ اور معتزلہ) کے رد و ابطال کے لئے متکلمین اسلام کا گروہ اٹھا، یہ

---

[89] - حدیث دوستاں ص ۵۳۸ تا ۵۵۱ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر: مکتبہ ضیاء الکتب

حضرات فلاسفہ و معتزلہ کے تعاقب میں ہر اس جگہ پہونچے جہاں ان کی کوئی معمولی سے معمولی پناہ گاہ تھی، اور ہر ایک کو اجاڑ ڈالا، ان حضرات کا کام صرف ان گمراہوں کی عمارتوں کا ڈھانا تھا، اس کے لئے انہوں نے وہی ہتھیار استعمال کئے جو اہل ضلال استعمال کیا کرتے تھے، لیکن اس کے نتیجے میں انھیں اصطلاحوں کی بنیاد پر عقائد کی تشریح و تعبیر کی ایک اور عمارت کھڑی ہو گئی، جو متکلمین کی جانب منسوب ہوئی، اور چونکہ اس میں بھی وہی گارا پانی استعمال ہوا تھا، جو فلاسفہ اور معتزلہ کے یہاں رائج تھا، اس لئے متکلمین کے مسائل و دلائل بھی بہت کم اعتراض و ایراد سے خالی رہے، اور بظاہر بہت سی جگہ ان کا پلہ کمزور معلوم ہوتا ہے، مثلاً جزء الذی لا یتجزی کے اثبات کے لئے متکلمین کے پاس کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے، لیکن چوک یہیں ہوئی، کہ انہیں عقائد کا شارح مان لیا گیا، یہ حضرات عقائد کے شارح نہیں ہیں، گمراہوں کی سرکوبی کرنے والے "جنود الٰہیہ "ہیں، انہوں نے زائغین کی تمام عمارتیں انھیں کے اوزاروں سے ڈھادیں، اب رہا ایمان و اعتقاد کا مسئلہ، اس کے سلسلے میں جتنا کچھ قرآن و حدیث میں بیان کر دیا گیا ہے، وہ بہت کافی ہے، اس پر اضافہ کرنا اس سے زیادہ اس میں خوض کرنا ممنوع ہے، حدیث میں تفکر فی الخالق سے منع کیا گیا ہے۔۔۔۔

تم نے فلاسفہ، معتزلہ، اور متکلمین کا اکھاڑا شرح عقائد میں دیکھ لیا ہو گا، ہر ایک اپنی اپنی طاقت کے مطابق زور آمائی کر رہا ہے، اس اکھاڑے میں فلاسفہ اور معتزلہ مدعی ہیں، اور متکلمین منکر ہیں، جب تک وہ انکار پر قائم رہتے ہیں ان کا پہلو غالب رہتا ہے، اور جب وہ خود مدعی بن کر سامنے آجاتے ہیں تو فلاسفہ و اخوانہم انہیں اعتراضات کا نشانہ بنالیتے ہیں، اور نتیجہ کے طور پر متکلمین مغلوب معلوم ہونے لگتے ہیں، خوب سمجھ لو کہ علم کلام کا موضوع تشریح عقائد نہیں ہونا چاہئے، بلکہ

تردید ضلالت ہونا چاہئے، تشریح میں خوض وتفصیل ممنوع ہے، اس میں اجمال پر اکتفا ضروری ہے، میری یہ بات گو کہ انھونی معلوم ہو مگر انکار میں جلدی نہ کرنا، حقیقت یہی ہے کہ علم کلام کی اکثر تفصیلات اعتراض سے مملو ہیں، شرح عقائد سے بڑا اکھاڑا دیکھنا ہو شرح مواقف میں دیکھو، کم کوئی مسئلہ ایراد سے خالی پاؤگے، اس میں اور دوسرے پہلوان بھی زورآزمائی کرتے نظر آئیں گے،۔۔۔۔۔ علم کلام سے صرف وہی کام لینا چاہئے، جس کی طرف میں نے اشارہ کیا، اثبات عقائد کی راہ میں فلاسفہ ومعتزلہ کی اصطلاحات سے دور ہی رہنا بہتر ہے، صرف قرآن وحدیث کے الفاظ اختیار کرنے چاہئیں، ضرورۃً ان کی اصطلاحیں لی جاسکتی ہیں۔

دیکھو! قرآن وحدیث میں لفظ قدیم، واجب الوجود، لاعرض، لاجوہر، لامحدود، لامعدود، لامتبعض، لایتجزیٰ، لامترکب، لایوصف بالماہیۃ وغیر ذلک کثیر من الالفاظ، یہ سب قرآن وحدیث میں کہاں ہیں؟ کہ ان کے اثبات یا نفی کے درپے ہو جائیں، حق تعالیٰ کی ذات ہو یا صفات، سب غیب ہیں اور غیب تک رسائی اپنی عقل کے ذریعے یا کسی بھی انسانی عقل کے واسطے سے ممکن نہیں ہے، اس کا طریقہ صرف وحی الٰہی ہے، وحی کے ذریعے جو الفاظ ہمیں مل گئے صرف انہیں پر اکتفا کرنا ضروری ہے، ورنہ سوائے رجماً بالغیب کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا[90]۔

واقعی مولانا کی اس تحریر میں بڑی معنویت اور استدلال میں بڑی قوت ہے، اور یہ آپ کے وسیع علم ومطالعہ کی دلیل اور علم کلام کا صحیح تجزیہ ہے۔

مولانا کی تحریرات میں اس طرح کے نوادر الحقائق کی کمی نہیں ہے، وہ اپنے عہد کے انتہائی ذہین، قوی الحافظہ اور بالغ نظر علماء میں تھے، آپ کی شخصیت میں علم، قلم، زبان، تقویٰ، صحت فکر، حسن

---

[90] - حدیث دوستاں ص ۵۴۱ تا ۵۵۲ مؤلفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ، مرتبہ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ناشر: مکتبہ ضیاء الکتب

نظر، حسن اخلاق، حسن انتظام اور حسن تربیت کے ایسے عناصر جمع ہو گئے تھے جس نے آپ کو عدیم النظیر بنا دیا تھا، آپ جیسی جامع الکمالات شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے، اللہ پاک آپ کے درجات بلند کرے اور آپ کے نقوش قدم پر ہمیں چلنے کی توفیق بخشے آمین[91]۔

اختر امام عادل قاسمی

[91] - تحریر بمقام جامعہ ربانی منورواشریف، بہار ۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۲ھ مطابق ۲۲/ دسمبر ۲۰۲۰ء